تبدیلی کی سائنس سیریز 1

عام آدمی کا فلسفہ

جدلیاتی و تاریخی مادیت



مسعود خالد

عام آدمی کا فلسفہ

مسعود خالد

سانجھ
SANJH
PUBLICATIONS

عام آدمی کا فلسفہ   فلاسفی   مسعود خالد

اشاعت اوّل : 2019

ٹائٹل : سعید ابراہیم

تعداد : 500

قیمت : 300

Aam Admi Ka Falsafa

(philosophy in urdu by Masaud Khalid)

Printed by:

Maktaba Jadeed Press, Lahore.

Price:

In Pakistan: Rs. 300.00

Published by:

سانجھ

SANJH PUBLICATIONS

Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.

Phone: +92 3314686276

e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com

Web: www.sanjhpublications.com

ISBN: 978-969-593-301-5

اپنے والد محترم شیخ بشیر احمد کے نام

جن کی شفقت ذہنی ارتقا کے ہر مرحلے پر میرے لیے حوصلہ افزائی کا باعث بنتی رہی

حوالہ جات

1۔ سائنس (تاریخ کے آئینے میں) — جے ڈی برنال

2۔ فیورباخ اور کلاسیکی جرمن فلسفے کا خاتمہ — اینگلس

3۔ فلسفہ کیا ہے — اشفاق سلیم مرزا

4۔ مذہب سائنس اور فلسفہ — مشتاق احمد

5۔ تاریخ فلسفہ مغرب — برٹرینڈ رسل

6۔ سائنسی فکر اور ہم عصر زندگی — ثاقب رزمی

7۔ سائنسی نقطہ نگاہ — برٹرینڈ رسل

8۔ تاریخ فلسفہ یونان — نعیم احمد

9۔ فلسفہ، سائنس اور کائنات — ڈاکٹر محمود علی سڈنی

10۔ مارکسزم، ایک مختصر تعارف — عاصم شجاعی

فہرست

کتاب کی غرض وغایت

کائنات اور اس کے مظاہر کو سمجھنے کی کسی شعوری کوشش کے بغیر ہم اپنی زندگی کے روزانہ مشاغل میں بے فکری سے مصروف رہتے ہیں۔ نہ ہم اس کو کوئی اہمیت دیتے ہیں نہ اس طرف کوئی خیال جاتا ہے کہ وہ کونسی مشینری ہے جو سورج کی دھوپ کو پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے زمین پر زندگی کا وجود ہے۔ ہم اس کشش ثقل کی طرف بھی توجہ نہیں دیتے جس کی وجہ سے ہم زمین پر قائم ہیں ورنہ اس کشش ثقل کے بغیر تو ہم زمین سے اڑ کر فضا میں پہنچ جاتے۔ کائنات تو الگ ہم اپنے اردگرد ان معاشرتی حالات کو بھی حادثاتی سمجھتے ہیں اور ان واقعات کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے جو ہمارے ساتھ پیش آتے ہیں۔ کائنات اور اس کے مظاہر کو سمجھنے کی ابتدا تو ہزاروں سال پہلے ہو چکی تھی مگر معاشرے کو سمجھنے، اس میں رونما ہونے والے واقعات اور تاریخ کو سمجھنے کی ابتدا ہوئے ابھی چند صدیاں ہوئی ہیں۔ انسانی سماج بھی چونکہ اس مادی کائنات کا حصہ ہے۔ اس کتاب میں یہ سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ جس طرح مادی کائنات میں کارفرما قدرت کے قوانین کو دریافت کر کے انسان نے قدرت پر غلبہ حاصل کیا ہے انسان کو فطرت کی غلامی سے نکالا ہے عام آدمی کی زندگی میں آسانیاں پیدا کی ہیں۔ کیا اسی طرح ہم معاشرے کی تسخیر کے ذریعے معاشرے میں ہونے والی بے انصافیوں، ظلم، استحصال، غلامی، جہالت کے اسباب جان کر اور معاشرتی ترقی اور خوشحالی کے قوانین سے واقفیت حاصل کر کے معاشرتی ترقی کے ان سائنسی قوانین کو لاگو کرنے کے ذریعے دکھوں سے پاک، خوشحالی، انصاف پر مبنی معاشی مساوات کا حامل معاشرہ قائم کر سکتے ہیں؟ یہ کتاب تبدیلی کی خواہش رکھنے والے ہر پاکستانی کے لیے ہے خواہ اس کا تعلق کسی بھی

سیاسی پارٹی سے ہو، کسی بھی سیاسی کارکن کے لیے یہ سیریز اس لیے اہم ہے کہ اس سے اس کو اپنی تبدیلی کی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے حکمت عملی بنانے میں مدد ملے گی۔ عام آدمی جو اب تک کی انسانی تاریخ میں نظاموں کو بدلنے کے لیے ایک حرکی قوت رہا ہے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد وہ اپنے طبقے کی فلاح کا نظام تشکیل دینے میں کامیاب ہوگا۔

محمد مسعود خالد

جڑواں فلسفے

1۔ آپ موٹر سائیکل پر کہیں جا رہے ہیں کہ راستے میں آپ کی موٹر سائیکل خراب ہو کر بند ہو جاتی ہے۔ آپ فوری طور پر موٹر سائیکل کو سڑک کے ایک کنارے پر لے جاتے ہیں اس کا پٹرول چیک کرتے ہیں پھر اس کا پلگ اتار کر دیکھتے ہیں۔ اگر آپ کی سمجھ میں ان دونوں وجوہات کی بناء پر موٹر سائیکل بند نہیں ہوئی تو اس کے بند ہونے کی کسی اور وجہ کو بھی آپ موٹر سائیکل کی ساخت کے اندر ہی تلاش کرتے ہیں۔ یہ آپ کا پہلا اور فطری ردعمل ہے۔

2۔ آپ کی زیر کفالت افراد میں گھر کا کوئی فرد بیمار پڑ جاتا ہے۔ آپ اس کو تشویش ناک حالت میں دیکھ کر ہسپتال لے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سب سے پہلے اس کا ٹمپریچر نوٹ کرتا ہے۔ بلڈ پریشر ناپتا ہے۔ دیگر کئی ظاہری علامتوں سے متعلق سوال کرتا ہے پھر کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیتا ہے۔ یہ ٹیسٹ میڈیکل ٹیکنالوجی کی مدد سے بیماری کی وجوہات کو انسانی جسم کے اندر تلاش کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ٹیسٹوں کے نتائج دیکھ کر بیماری کا پتہ چلایا جاتا ہے جس کے بعد علاج کا مرحلہ آتا ہے۔ میڈیکل سائنس کا سارا علم بیماری کی وجوہات کو انسانی جسم کے اندر ہی تلاش کرنے کی تحقیق ہے۔

3۔ آپ کو یاد ہو گا جس دن زلزلہ آیا تھا۔ زلزلے کے جھٹکے محسوس کرتے ہی آپ نے لوگوں کو کھلی جگہ کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ انہی دنوں آپ نے زلزلہ کے آنے کی وجوہات سے متعلق کئی باتیں بھی سنی ہوں گی۔ علم الارضیات کے ماہرین نے زلزلے کی وجوہات کو زمین کی ساخت میں تلاش کیا اور پتہ چلایا کہ ہماری زمین ٹیکٹونک پلیٹوں سے بنی ہے۔ جب یہ پلیٹیں ایک دوسرے پر کھسکتی ہیں تو تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ اسے زلزلہ کہتے ہیں۔ اب تو آلات کی مدد سے زلزلے کے مرکز اور گہرائی کی پیمائش بھی کر لی جاتی ہے۔

اوپر دی گئی مثالوں میں موٹر سائیکل، انسان اور زمین تینوں مادی چیزیں ہیں اور مادہ کی تعریف کے مطابق مادی اشیاوزن رکھتی ہیں اور جگہ گھیرتی ہیں۔ان مثالوں میں آپ نے دیکھا کہ مادی چیزوں میں حرکت وتبدیلی کو ان کی ساخت میں تلاش کیا گیا ہے۔کسی مادی شے میں حرکت یا تبدیلی کو اس کی ساخت میں تلاش کرنا مادی رویہ کہلاتا ہے۔مادے میں حرکت وتبدیلی کی جو وجوہات اس کی ساخت میں دریافت کی جاتی ہیں انہیں مادی وجوہات کہتے ہیں۔مادے میں حرکت وتبدیلی کی وجوہات مادے کی ساخت ہی میں موجود ہوتی ہیں ایسا یقین کرنا مادیت کہلاتا ہے۔

آیئے اب ہم اوپر دی گئی تین مثالوں کو ایک دوسرے زاویئے سے دیکھتے ہیں۔

1۔جب آپ موٹر سائیکل لے کر گھر سے باہر نکل رہے تھے تو آپ کی والدہ نے آپ کو رات گئے گھر سے باہر جانے سے منع کیا تھا۔مگر آپ ہیں کہ آپ نے ماں کی ایک نہ سنی اور چل دیئے آپ نے نافرمانی کی۔جب آپ واپس گھر لوٹے تو گھر والوں نے دیر سے لوٹنے کی وجہ پوچھی آپ نے موٹر سائیکل خراب ہونے کا سارا واقعہ سنا دیا۔تو سب گھر والے آپ کو یقین دلانے پر لگ گئے کہ دیکھا ماں کی نافرمانی کا نتیجہ؟

آپ کے اردگرد بہت سے لوگوں کو یقین تھا کہ آپ کے موٹر سائیکل میں خرابی کی وجہ ماں کی نافرمانی ہے۔

2۔آپ کا چھیل چھبیلہ نوجوان جو بیمار ہے جسے آپ ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے جواب ہسپتال میں زیر علاج ہے۔عزیز وا قارب اس کی تیمارداری کے لیے آرہے ہیں زیادہ تر خواتین کا خیال ہے کہ یہ صاحب کچھ دن پہلے شادی کی تقریب میں بوسکی کا سوٹ پہنے،سونے کا لاکٹ گلے میں لٹکائے،چہرے پر مسکراہٹ سجائے ہجوم میں ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔بس کسی کی نظر لگ گئی۔نظر بد سے اللہ بچائے جی پتھر پھاڑ دیتی ہے۔لیبارٹری میں ٹیسٹ جو لیے تھے ان کا رزلٹ بھی آگیا ہے۔ہیپا ٹائٹس بی تشخیص ہوا ہے۔لیکن آپ کے اردگرد لوگوں کی طرف سے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ بیماری کی وجہ جسم کے اندر کسی عضو کی ساخت میں نہیں بلکہ باہر کسی کے خیال،بدنیتی حسد یا نظر بد میں ہے۔

3۔جس دن زلزلہ آیا تھا اس دن آپ کے اردگرد سیانے لوگوں نے آپ کو بتایا تھا کہ زلزلے ہمارے برے اعمال کے نتیجے میں آتے ہیں۔بلکہ سیلاب بھی شامت اعمال کے طور پر

آتے ہیں۔آسمانی بجلی گرنا۔فصلوں کی پیداوار میں کمی۔وبائیں،بیماریاں ہماری منافقت ،جھوٹ اور غلط کاریوں کا نتیجہ ہوتے ہیں......ایسی باتیں کرنے والے تو شاید چند جاہل لوگ تھے۔اسی شام سرکاری اور پرائیویٹ چینلوں پر علمائے کرام کو بلا کر ٹاک شوز کروائے گئے تھے۔علمائے کرام نے تو یقین دلا دیا کہ زلزلے،سیلاب اور وبائیں ہمارے برے اعمال کے نتیجے میں آسمان سے نازل ہوتے ہیں۔

ان تینوں مثالوں کو اب ایک دوسرے زاویئے سے دیکھنے سے ہمیں پتہ چلا کہ مادی اشیا میں حرکت وتبدیلی کی وجہ ان کی ساخت اور ان کے وجود سے باہر کوئی خیال یا جذبہ ہے۔اوپر کی تینوں مثالوں میں حرکت اور تبدیلی کی وجوہات نافرمانی،نظر بد اور شامت اعمال پہچانی گئی ہیں۔یہ تینوں بیرونی عامل ہیں جو باہر سے مادی اشیاء پر اثر انداز ہوئی ہیں۔اثر انداز ہونے والی تینوں چیزیں مادی نہیں ہیں بلکہ خیال یا جذبہ ہیں۔کسی مادے میں حرکت وتبدیلی کو اس کی ساخت سے باہر کسی خیال یا جذبے سے منسوب کرنا خیالی رویہ ہے۔یہ سمجھنا کہ مادے میں حرکت وتبدیلی کسی بیرونی غیر مادی عامل کے اثر انداز ہونے سے رونما ہوتی ہے خیالیت،تصوریت کہلاتا ہے۔

یہ چند مثالیں ہم نے آج کے زمانے کی روزمرہ زندگی سے لی ہیں اور ان کو دو الگ الگ زاویوں سے دیکھا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آج کے لوگوں میں مادے میں حرکت وتبدیلی کے بارے میں دو رائے پائی جاتی ہیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مادے میں حرکت وتبدیلی کی وجوہات مادے کی ساخت کے اندر ہی موجود ہوتی ہیں اور کچھ دوسرے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مادی چیزوں میں حرکت وتبدیلی بیرونی غیر مادی عامل کی وجہ سے رونما ہوتی ہے یہ بیرونی عامل نیت،خیال،ارادہ،اعمال،منافقت،نافرمانی وغیرہ ہوتے ہیں۔

تہذیب کے ابتدائی دور میں بھی یہی سوال انسان کے ذہن میں ابھرتا تھا کہ ان کے اردگرد موجود مادی دنیا،یہ سلسلہ کائنات کیسے چل رہا ہے۔ہمارے اردگرد یہ تبدیلیاں کیسے رونما ہوتی ہیں؟ اس وقت کے لوگوں میں بھی دو طرح ہی کی رائے موجود تھی۔کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مادے کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس میں حرکت وتوانائی کا ایک خودکار نظام موجود ہے۔ان لوگوں کے اس خیال کو مادیت کا نام دیا گیا۔یہ ان لوگوں کا محض سادہ سا خیال تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ

آنے والی نسلوں نے اس خیال پر تحقیق اور اضافے کیے جس سے مادیت نے ایک باقاعدہ نظام فکر سوچنے کے ایک ڈھنگ، کائنات کو جاننے کے ایک اسلوب کی شکل اختیار کر لی اور اس پورے نظام فکر کو فلسفہ مادیت (Materialism) کا نام دیا گیا۔

ابتدائی دور کے اس زمانے کے کچھ دوسرے لوگ جن کا خیال تھا کہ مادہ ایک مردہ، بے جان اور بے حرکت شے ہے اس کو حرکت دینے کے لیے بیرونی عامل کی ضرورت ہے اس زمانے میں بھی یہ بیرونی عامل تصور یا خیال مانا جاتا تھا یعنی کوئی (Idea) اس کائنات کو متحرک رکھتا ہے اس طرح کی سوچ کو خیالیت، تصوریت کہا گیا۔ آنے والی نسلوں نے اس بنیادی خیال کو مزید دلائل سے مضبوط کیا۔ نئے خیالات کو اس دھارے میں شامل کیا جس سے خیالیت ایک باقاعدہ نظام فکر بن گئی اس کو تصوریت (Idealism) کہتے ہیں۔

مادیت اور خیالیت کے فلسفوں نے چونکہ ایک ہی سوال کے دو جواب کی صورت میں جنم لیا اس لیے انہیں جڑواں فلسفے کہا گیا ہے۔ سوال تھا کہ مادہ کس طرح حرکت میں ہے جواب تھے کہ اندرونی توانائی اور ساخت کی وجہ سے دوسرا جواب تھا کہ بیرونی عامل کی وجہ سے۔

مادیت اور خیالیت دو الگ الگ، متضاد، مگر ریل کی پٹڑی کی طرح یا دریا کے کناروں کی طرح ہمیشہ ساتھ ساتھ چلنے والے فلسفے ہیں۔ بلکہ دنیا کو دیکھنے کے، زندگی کو سمجھنے کے، اپنے مسائل کا تجزیہ کرنے کے، اپنے سامنے رونما ہونے والے واقعات کو سمجھنے کے دو زاویے، دو نظریے دو طریقے ہیں۔ یہاں تک کہ ہماری گفتگو میں پیش کیے جانے والے خیالات بھی یا تو مادیت کے نظریے کا اظہار ہوتے ہیں یا خیالیت کا۔

مثال کے طور پر کوئی شخص اگر یہ کہتا ہے کہ کرکٹ ٹیم نے میچ تکنیکی مہارت اور مربوط کوشش سے جیتا ہے تو یہ مادی اظہار ہے اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ کرکٹ میچ قوم کی دعاؤں سے جیتا ہے تو یہ خیالیت کے فلسفے کی تصدیق ہے۔

اس طرح مظاہر فطرت کی تشریح کے بھی مادی اور خیالی دو الگ الگ طریقے ہیں۔ بارش کیوں ہوتی ہے؟ اس کے دو جواب ہیں۔ سطح سمندر سے اٹھنے والے بخارات ٹھنڈے زون میں جا کر بادلوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ہوائیں انہیں خشکی کی طرف اڑا کر لے آتی ہیں جہاں وہ بارش بن کر برستے ہیں یہ اس کا مادی تجزیہ ہے۔

کچھ لوگوں کے نزدیک گرمی کے دنوں کے طویل روزوں کی سختی سے روزہ داروں کو راحت پہنچانے کے لیے بارش ہوتی ہے یا کچھ انسانوں کی خواہش کے نتیجے میں بارش ہوتی ہے یہ اس کا خیالی تجزیہ ہے معاشرتی عوامل کو بھی انہی دو زاویوں سے دیکھا جاتا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کی 55 فیصد آبادی غربت کی لائن سے نیچے زندگی گزار رہی ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ مادیت کا زاویہ نظر رکھنے والے لوگوں کے مطابق غربت کی وجہ پسماندہ زرعی معیشت پر جامد رہنا، غیر ملکی مصنوعات کی درآمدات سے سرمایہ کی صنعتی ممالک کو نکاسی، سرمایہ کی نکاسی سے ملک میں پیدا ہونے والے خلا کو قرضوں سے بھرنا اور ان قرضوں کے ساتھ آنے والی شرائط کو پورا کرنے کے لیے ملک کی پیداواری قوتوں کو کچلنا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ امیر اہلسنت حضرت الیاس قادری فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں غربت اور بدحالی کی وجہ (۱) کعبہ شریف کی طرف ٹانگیں کر کے سونا (۲) جوتے بے احتیاطی سے اتارنا جس کی وجہ سے جوتے کے تلوے آسمان کی طرف ہو جاتے ہیں اور غربت پیدا کرتے ہیں (۳) نماز پڑھتے ہوئے بار بار ہلنا اور ناک میں انگلی مارنا۔ یہ ہیں غربت کے اسباب۔

فلسفہ مادیت کے اس بنیادی خیال نے کہ مادے میں حرکت و تبدیلی مادے کی ساخت میں موجود خود کار نظام اور اندرونی توانائی کی وجہ سے ہوتی ہے آگے چل کر سائنس کو جنم دیا اور خیالیت کے اس بنیادی تصور نے کہ مادے میں حرکت و تبدیلی کسی غیر مادی بیرونی عامل کے اثر انداز ہونے سے رونما ہوتی ہے دنیا کے تمام تر مذاہب کو جنم لیا دیا۔

یا یوں کہیے کہ مادیت کی کوکھ سے سائنس نے جنم لیا اور خیالیت کی کوکھ سے مذاہب نے جنم لیا۔

فلسفہ یا مابعد الطبیعات

فلسفہ اور مابعدالطبیعات دو متضاد نظریے ہیں۔ بعض لوگ مابعدالطبیعات کو بھی فلسفہ ہی سمجھ لیتے ہیں جس سے بہت سی الجھنیں جنم لیتی ہیں۔ مادیت اور خیالیت کو جڑواں فلسفوں کا نام اس لیے دیا گیا تھا کہ دونوں نظریوں نے ایک ہی سوال کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔

سوال یہ تھا کہ یہ سلسلہ کائنات، مادی دنیا اور اس میں جو کچھ ہے وہ کیسے چل رہا ہے؟ اس کا پہلا جواب یہ تھا کہ یہ مادی کائنات کسی بیرونی عامل کے اس پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے چل رہی ہے۔ اس سوچ کو (IDEALISM) یا خیالیت کا نام دیا گیا۔ ابتدائی انسانوں کی روزمرہ زندگی کا مشاہدہ یہ تھا کہ ان کے اردگرد کی دنیا میں کوئی بھی چیز تب تک جامد و ساکن رہتی ہے جب تک کوئی بیرونی عامل اسے اپنی جگہ سے ہلاتا نہیں تھا۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کسی چیز میں تب تک تبدیلی واقع نہیں ہوتی جب تک کوئی بیرونی عامل اسے تبدیل نہیں کرتا۔ قدرتی بات ہے کہ ان کا یہ مشاہدہ ان کے خیالات و عقائد میں اس طرح منعکس ہوا کہ ان کے نزدیک مادی کائنات بھی کسی بیرونی عامل کے اس پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے چل رہی تھی۔

مادی دنیا تو ان کے مشاہدے میں آتی تھی مگر اس کو چلانے والا بیرونی عامل نہ صرف ان کی آنکھوں سے اوجھل تھا بلکہ ان کی سوچ، فہم و ادراک سے بھی ماورا تھا۔ بیرونی عامل کے بارے میں جتنے خیالی مفروضے قائم کیے گئے۔ جتنے دلائل انسانی ذہن نے تخلیق کیے ان سب کو ملا کر علم کی جو شاخ پھوٹی اس کو علم الٰہیات (Theology) کہتے ہیں۔

اس کا دوسرا حصہ عالم بالا، باطنی دنیا اور غیب کا تصور ہے کہ اس مادی کائنات کے علاوہ بھی ایک دنیا، ایک جہان موجود ہے۔

آئیڈیلزم، خیالیت یا تصوریت کا مرکزی خیال بیرونی عامل کے تصور سے شروع ہوا اور ترقی کرتا ہوا ایک فکری نظام بن گیا۔ سب سے پہلے بیرونی عامل کے تصور نے دیوی دیوتا تخلیق کیے جو اس کائنات کو چلا رہے تھے۔ دیوی دیوتاؤں کے حوالے سے مادی دنیا کے مظاہر کی تشریح کہانیوں کے ذریعے کی گئی ان کہانیوں پر لوگ صدق دل سے ایمان رکھتے تھے ان فرضی قصوں کو مائتھالوجی کہا جاتا ہے۔

صدیوں کے بعد انسانی سوچ میں تبدیلی آئی ہزاروں دیوی دیوتاؤں کی بجائے نیکی اور بدی کے دو خداؤں کے تصور نے انسانی معاشرت پر گرفت کی۔ یہ سلسلہ فکر بالآخر ایک خدا کے تصور تک آ کر رک گیا۔ ایک خدا کی قدرتوں اور اس کی صفات کے حوالے سے کائنات، اس کے مظاہر اور حوادث کی تشریح ہونے لگی۔ خدا کی حاکیت اور انسان کی بے بسی (تقدیر) کے حوالے سے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کا زاویہ فکر وجود میں آیا۔

کوئی بھی فکری نظام ایک کل ہوتا ہے اس کا ہر جز واس کی مرکزی فکر کے تابع ہوتا ہے یہ نہیں ہوسکتا کہ آئیڈیلزم کا مرکزی خیال کچھ اور ہو اور اس کا نظریہ تخلیق، نظریہ وجود، نظریہ علم اس کی اخلاقیات، جمالیات کوئی علیحدہ درس دے رہی ہو۔ آئیڈیلزم کے فکری نظام کے کل کو مابعد الطبیعات (Metaphysics) کہتے ہیں۔

مظاہر فطرت ہوں، دیوی دیوتا ہوں یا خدا کی ذات، انسان نے ہمیشہ سے انہیں اپنے جیسی سوچ، جذبات و احساسات رکھنے والا تصور کیا ہے۔ ان کو خوش رکھنے اور اپنے اوپر مہربان رکھنے کے لیے ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتا جیسے سلوک کرنے پر وہ خود خوش ہوتا اور دوسروں پر مہربان ہوتا۔

وہ جانتا تھا کہ وہ اپنی تعریف سن کر، دوسروں سے تحفے وصول کر کے اور دوسروں کو اپنے سامنے تابع فرمان جھکا ہوا دیکھ کر خوش ہوتا ہے چنانچہ اس نے مظاہر فطرت، دیوی دیوتا یا خدا کو خوش کرنے کا یہی طریقہ اپنایا۔ وہ ان کی تعریفیں کرنے لگا۔ ان کے آگے جھکنے لگا اور نذریں پیش کرنے لگا۔ بدروحوں اور نقصان پہنچانے والے دیوتاؤں کے شر سے بچنے کے لیے اس قسم کی حرکتیں کرتا جو وہ اپنی زندگی میں اپنے دشمنوں کو بھگانے کے لیے کرتا تھا۔ دنیا کے تمام تر مذاہب کی تمام تر عبادات اور رسومات اسی کا تسلسل ہیں۔

شروع شروع میں یہ کام انسان گروہ ہی کی صورت میں کرتے تھے۔لیکن بعد میں گروہ میں سے کوئی بزرگ یا دانا شخص دیوتاؤں کو خوش کرنے اور روحوں کو بھگانے کی رسمیں گروہ کی نمائندگی کرتے ہوئے ادا کرنے لگا۔اس منصب پر فائز ہونے سے اس کی عزت میں بے پناہ اضافہ ہوا اور اس کی دولت میں بھی۔اس عمل میں پہلا مذہبی پیشوا رونما ہوا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی عملداری میں توسیع ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ آج کے پیچیدہ معاشرے کے افراد کی زندگیوں کے ایک ایک لمحے پر مسلط ہے۔

غلاموں اور جانوروں کی قربانی تک کا فریضہ پروہت، پجاری یا مذہبی پیشوا خود ادا کرتا وہ کسی تیز دھار آلے سے جانور یا زندہ غلام کا سینہ چیر کر اس کا دھڑکتا ہوا دل ہاتھ میں پکڑ کر جھٹکے سے باہر نکال لیتا اور دیوتا کے حضور پیش کرتا۔بچوں کی قربانی اس طرح دیتے کہ دیوتا کے ہاتھ آگے کی طرف پھیلائے ہوتے تھے۔کہنیاں اس کے پیٹ کے ساتھ جڑی ہوتی تھیں۔دیوتا کا پیٹ کھلا ہوتا اور اس کے اندر آگ کا الاؤ جل رہا ہوتا۔دیوتا کے ہاتھوں پر چربی مل دی جاتی۔بچے کو دیوتا کے ہاتھوں پر لٹا دیا جاتا۔جو پھسل کر دیوتا کے پیٹ میں جلتے ہوئے آگ کے الاؤ میں جا گرتا۔اس موقع پر پروہت اور معبدوں کا عملہ نگارے بجاتا اور اونچی آواز میں بھجن گاتا۔اس ہنگامے اور شور میں بچے کی چیخیں دب جاتیں اور کسی کو سنائی نہ دیتیں۔

لوگوں میں انجانی دنیا کا خوف پیدا کرنے کے لیے فرضی قصے،موت کا خوف پیدا کرنے کے لیے من گھڑت کہانیاں،خوفناک انجانی دنیا اس میں لوگوں کی تنہائی اور بے بسی کے افسانے اتنی مشاقی سے تخلیق کیے جاتے کہ لوگ ان پر فوری ایمان لے آتے۔ان کہانیوں پر یقین کرنے کی وجہ سے بنی نوع انسان اتنے لاچار ہو چکے تھے کہ انہیں یہ تک یقین نہیں تھا کہ رات کے بعد دن ہوگا۔سردیوں کے بعد بہار آئے گی۔قدیم زمانے کے لوگ فجر کے وقت مذہبی عبادتیں کرتے کہ سورج آسمان سے بلند ہو۔مصر میں فرعون جو سورج کا اوتار سمجھا جاتا تھا ہر روز مندر کے گرد ایک چکر لگاتا تھا کہ سورج بھی اپنا روزانہ کا ایک چکر پورا کرے۔

جب ہر انسان ہر نئی چیز کا استقبال اپنے اندر ایک انجانے خوف سے کرتا پھر اس خوف پر قابو پانے کے لیے مذہبی پیشوا کی بتائی ہوئی پناہ گاہوں کی طرف رجوع کرتا۔اسی زمانے میں کچھ لوگ پروہتوں کی کی عیاریوں کا پردہ چاک کرتے۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا انسان اپنے اردگرد کے ماحول اور چیزوں سے واقفیت حاصل کرتا چلا گیا اس نے اپنے خوف پر قابو پانا شروع کر دیا۔جس سے اس میں ایک اعتماد پیدا ہوا اس نے اردگرد کی معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ہی دیوتاؤں کے ٹھکانے کے متعلق سوال پوچھنا شروع کیے تو پروہتوں کو نئی کہانیاں تخلیق کرنی پڑیں۔

درختوں سے ڈھکی پہاڑی کی چوٹیوں سے اور گپھاؤں سے نکال کر دیوتاؤں کو آسمان پر بھیجنا پڑا۔انسان اپنے تجربے سے سیکھ چکا تھا کہ اگر فجر کے وقت مناجات نہ بھی بلند کیے جائیں تو بھی سورج آسمان سے بلند ہوتا ہے۔فرعون مندر کا ایک چکر نہ بھی لگائے تب بھی سورج اپنا روز کا چکر پورا کرتا ہے۔بارش کے لیے جادوگر یا مذہبی پیشوا منہ میں پانی بھر کر ایک مخصوص ناچ کے ذریعے اردگرد پانی چھڑکتا اور بارش روکنے کے لیے وہ چھت پر چڑھ کر پھونکیں مارتا اور بادلوں کو بھگا دیتا۔پھر لوگوں نے دیکھا کہ ایسا کرنے سے نہ بارش ہوتی ہے نہ بادل چھٹتے ہیں۔

انسان کا تجربہ بڑھتا گیا۔وہ اپنے شعور کے روشن حلقے کو وسیع تر کرتا گیا اور دیوتاؤں کو پسپا کرتا گیا۔اب انسان نے اردگرد کی مادی چیزوں کو اور کائنات کو مذہبی پیشوا کی فراہم کی ہوئی آسمانی معلومات کی عینک لگا کر دیکھنے کی بجائے زمینی معلومات کے ذریعے اسے جانچنا شروع کر دیا۔اس کا مشاہدہ بتاتا تھا کہ پانی ہمیشہ ڈھلوان کی طرف بہتا ہے تو اس کی وجوہات کو ڈھلوان اور پانی کے درمیان رشتے کی مدد ہی سے معلوم کرنا چاہیے نہ کہ اس کی وجوہات جاننے کے لیے کسی خود ساختہ آسمانی رہنمائی کے لیے پروہت یا مذہبی پیشوا سے رجوع کرنا چاہیے۔مٹی میں لوہا زنگ آلود ہو کر مٹی ہی میں گھل مل جاتا ہے۔اس عمل کی وجہ کو بھی مٹی اور لوہے ہی میں تلاش کرنا چاہیے نہ کہ آسمان میں۔کائنات،مظاہر فطرت،تخلیق،زندگی کی نمود جیسے سوالوں کے جواب بھی خود اشیاء ہی کے حوالوں میں تلاش کیے جائیں۔آسمانی مداخلت کے حوالے کے بغیر مادی اشیاء میں حرکت و تبدیلی کو سمجھنے کی کوشش نے جس علم کو جنم دیا اس کا نام فلسفہ ہے۔

اس طرح فلسفہ نے مابعد الطبیعات کی ضد یا مخالفت میں جنم لیا۔

اشفاق سلیم مرزا کہتے ہیں کہ ”دنیا میں فلسفہ کا آغاز اس وقت ہوا جب انسان نے دیو مالائی رشتوں سے کٹ کر اپنا رشتہ زمینی اور کائناتی ربط کے ساتھ جوڑا اور یہ بات چھٹی صدی قبل مسیح میں ایشیائے کوچک کے یونانی شہر میلٹس میں پیدا ہونے والے مفکر تھیلز سے منسوب کی جاتی ہے

جب اس نے کہا کہ دنیا میں موجود ہر شے پانی سے شکل پذیر ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ فلسفے کا آغاز ہو گیا۔ یہ ایسا مرحلہ تھا جہاں انسانوں نے دیوتاؤں اور ماورائیت کو خیر باد کہا اور جیتی جاگتی زندگی سے اپنا رشتہ جوڑ لیا اور انسانی فکر زمینی حوالے سے باتیں کرنے لگا (فلسفہ کیا ہے۔ ایک نئی مادی تعبیر)۔

فلسفے کا آغاز مابعد الطبیعات کی مخالفت سے ہوا۔ مابعد الطبیعات کا تعلق ماورائیت سے اور عالم غیب سے اور فلسفے کا تعلق دھرتی سے مادی کائنات سے رہا۔ اگر چہ مابعد الطبیعات اور فلسفہ کائناتی حقیقتوں کو جاننے کی انسانی ذہنی کاوش ہی کا نام ہے۔ فرق یہ ہے کہ مابعد الطبیعات اس کائنات، مظاہر فطرت، معاشرتی قوانین اور فکری نظام کو بیرونی عامل اور آسمانی مداخلت کے تصور کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش ہے۔ جبکہ فلسفہ کائناتی حقائق، مظاہر فطرت، معاشرتی قوانین اور فکری نظام کو زمینی حقائق یا مادی قوانین کے حوالے سے سمجھنے کا نام ہے۔

دنیا میں موجود تمام تر مذاہب مابعد الطبیعات کی پیداوار ہیں اور تمام نیچرل اور سوشل سائنسز فلسفہ کی۔ مابعد الطبیعات ہر مشکل کا حل اور ہر سوال کے جواب کو آسمانی رہنمائی سے منسوب کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اخلاقیات کو بھی اقدار کے نام پر آسمانی ہی سمجھا جاتا ہے جبکہ فلسفہ اخلاقیات کو بھی زمینی مادی حوالوں سے دیکھتا ہے۔ مادئین یا فلسفیوں کے نزدیک۔

"اخلاق وہ تجربی نتائج ہیں جو صدیوں کے دوران انسانوں کے درمیان معاشرتی تعلقات کے تواتر سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس لیے وہ آسمانی نہیں بلکہ تاریخی پیداوار ہیں۔ انسانی معاشرے کے معاشی اور معاشرتی نظام سے متعین ہوتے ہیں انسان کے باطنی یا مجرد تصورات سے نہیں بلکہ عملی معاشرتی رشتوں کے بطن سے پھوٹتے ہیں۔ کیونکہ انسانی زندگی ایک تجریدی مظہر نہیں بلکہ مادی مظہر ہے اور اس کے اپنے ہم جنسوں سے تعلقات بھی مادی نوعیت رکھتے ہیں۔"
معروضی اخلاقات کا اہم مسئلہ جذبات کی تنسیخ نہیں بلکہ جذبات کی تنظیم ہے۔ معاشرتی ماحول کو انسانی بنائے بغیر محض اخلاقی تصورات اور اخلاقی تلقین سے انسان کو ایک اخلاقی انسان نہیں بنایا جا سکتا اس لیے مادی (فلسفیانہ) اخلاقیات ایسے معاشرتی نظام کو بدلنے کی ذمہ داری عام آدمی پر ڈالتی ہے جس معاشرتی نظام سے بیمار معاشرتی ماحول جنم لیتا ہے۔ ایسے معاشرے کے قیام پر زور دیتی ہے جہاں فرد اور معاشرے کے مفادات میں تصادم ختم ہو جائے مابعد الطبیعات انسانی شعور کو

بھی آسمان سے ودیعت کیا ہوا تحفہ سمجھتی ہے جبکہ اس کے برعکس انسانی شعور کے بارے میں مادی (فلسفیانہ) نظریہ تھامس ہابس کی زبان میں یہ ہے "انسانی عقل پیدائشی نہیں ہوتی۔ ماحول اس کے ذہن پر تاثرات نقش کرتا ہے پھر مشق اور تجربے سے اس کی عقل ترقی کرتی ہے۔" عدل وانصاف کو بھی مابعد الطبیعاتی آسمانی تصور خیال کیا جاتا ہے جبکہ اس کا زمینی تصور فلسفی تھریسی میکس کی زبانی یہ ہے "عدل وانصاف نام ہے حکمران طبقے کے مفاد کی نگہداشت کا۔ چند طاقتور لوگوں نے کمزوروں اور غریبوں کو دبانے کے لیے قوانین بنا رکھے ہیں۔ مکار سیاستدان عوام کو ان قوانین کو مذہبی قرار دے کر انہیں اپنا مطیع رکھنا چاہتے ہیں۔"

فلسفہ اشیاء کی حقیقت کو غور وفکر سے سمجھنے، ان کی ماہیت کو جاننے کی کاوش کا نام ہے۔ فلسفی جو خیالات پیش کرتا ہے وہ اس نے اپنے اردگرد سے لیے ہوتے ہیں۔ واقعات کو اکٹھا کرتا ہے انہیں ایک ترتیب میں رکھ کر ایک جیسے عوامل اکٹھے کرتا ہے۔ ایک جیسے عوامل اور وجوہات نے اگر ایک جیسے نتائج پیدا کیے ہوں تو انہیں قانون، ضابطہ اور اصول کی شکل دیتا ہے۔ خیالات کی بناوٹ، ان کا منبع۔ ترتیب اس کا فلسفہ کہلاتا ہے۔

مابعد الطبیعاتی، ماورائی اور مذہبی خیالات دنیا کی آخری اور ناقابل تردید سچائی کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں اور ان کو من وعن تسلیم کرنے کا نام ایمان ہے۔ ایسی رائے جو ذہن میں میخ کی طرح گاڑ دی گئی ہو۔

فلسفی اپنے نتائج کو حرف آخر یا ابدی حقیقت نہ تو خود سمجھتا ہے نہ دوسروں سے ایسا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کا فلسفہ اس کی ذات کی خوبیوں خامیوں یا صادق اور امین ہونے کے حوالے سے نہیں پرکھا جاتا۔ فلسفہ کسی مذہب کا پیروکار نہیں ہوتا نہ کسی ملک کا شہری، وہ ساری دنیا کا شہری ہوتا ہے۔ فکر وتدبر اس کا مذہب ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے اسے اپنی سوچ اور اپنی فکر کے نتائج کہہ کر پیش کرتا ہے۔ وہ کسی ماوراتی ہستی سے رابطہ کر کے اپنی معلومات حاصل کرنے کا دعویٰ نہیں کرتا۔

مابعد الطبیعات کا اپنا الگ نظریہ علم ہے جبکہ فلسفے یا مادیت کا اپنا۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد۔ مخالف اور ایک دوسرے کے دشمن نظریات ہیں اگر چہ ایک ہی سوال کے جواب کی صورت میں ایک ہی سوال کی کوکھ سے جنم لینے والے تصورات۔ دو متحارب فکری نظام۔

پولیو ویکسینیشن اور فلسفہ مادیت

اب تو ہر خاص وعام یہ بات جانتا ہے کہ پولیو ایک وبائی مرض ہے اور پانچ سال سے کم عمر کے بچوں پر حملہ آور ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں پولیو میں مبتلا ہونے والے بچے باقی زندگی کے لیے اپاہج اور معذور ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی رنگینیوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں، ہنستے اور کھلکھلاتے بچوں کے کھیلوں میں وہ حصہ دار نہیں بن سکتے۔ زندگی بھر لوگوں کی رحم بھری نظروں کی بھیک وصول کرتے رہتے ہیں۔

میڈیکل سائنس کی دریافتوں نے جہاں انسانی زندگی کی بے شمار مشکلیں حل کر لی ہیں وہاں پولیو کی ویکسی نیشن کی دریافت نے ہر انسانی بچے کو پولیو سے نجات دلانے کی نوید سنائی ہے۔ عالم انسانیت نے اس وبائی مرض کے خلاف 2000ء میں ڈاکار کانفرنس میں اعلان جنگ کیا اور مشترکہ کوشش کے ذریعے 2015ء تک اس موذی مرض کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا عہد کیا۔ اس سے پہلے ایک ایسی ہی کوشش کے ذریعے چیچک کو صفحہ ہستی سے مٹایا جا چکا تھا۔ 2015ء پاکستان کے علاوہ ساری دنیا میں پولیو ختم کیا جا چکا تھا۔ 2017ء کی عالمی ادارہ صحت کی ایک رپورٹ کے مطابق پوری عالم انسانیت کے معصوم بچوں پر پاکستان کی وجہ سے ایک بار پھر پولیو کے وبائی مرض کے پھیلنے کا خطرہ منڈلا رہا تھا۔

ادھر پاکستان میں فاٹا اور پختونخوا کے علاوہ کراچی جیسے میٹرو پولیٹن شہر میں پولیو کے قطرے پلانے والی ٹیم اور ان کی حفاظت پر مامور پولیس والوں پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ پولیو کے قطرے پلانے والی عورتوں کو بھی موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔

دنیا حیرت زدہ تھی کہ ہم لوگ ان کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتے ہیں ان کے بچوں کے

مستقبل کو محفوظ بنانا چاہتے ہیں اور ان کو دیکھو کہ نہ صرف یہ کہ یہ بھلائی ہی نہیں کروانا چاہتے الٹا بھلائی کرنے والا پر گولیاں برساتے ہیں۔

اس کا پس منظر یہ کہ افغان جہاد کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ افواج پاکستان نے یہ جنگ نہ صرف امریکی اسلحہ اور امریکی ڈالروں کے زور پر لڑی بلکہ اس جنگ کی حمایت کے لیے اندرون پاکستان نظریاتی سرحدیں قائم کی گئیں۔ سوشلزم کا راستہ جہادیوں کے ذریعے روکنے اور سوشلسٹ نظریے کا راستہ مذہبی بنیاد پرستی کے ذریعے روکنے کے لیے پاکستان کی فکری تعمیر کی گئی۔ مدارس قائم کئے گئے۔ تعلیم کے نصاب کو مرکزی حکومت کے ہاتھ میں دے کر اس کو بنیاد پرست عسکریت پسندی پر استوار کیا۔ سیاسی سٹرکچر میں جگہ جگہ مذہبی (proxy) قائم کی گئیں۔ سوشل انجینئرنگ کی گئی جس کا مقصد پر تھا کہ نظام جبر واستحصال کے ردعمل میں اٹھنے والی عوامی تحریکوں کو ان مذہبی پراکسی گروہوں کے ذریعے سر نہ اٹھانے دیا جائے۔ ریاستی سرپرستی میں بنیاد پرستی کی فکری تعمیر کو عالمی سطح پر طالبائزیشن کا نام دیا گیا ہے۔ ایسی فکری تعمیر کرنے کے لیے جن مذہبی پیشواؤں کو اہم ذمہ داریاں سونپی گئیں انہوں نے ویکسینیشن کو نہ صرف حرام قرار دے دیا بلکہ یہ پراپیگنڈہ بھی کیا کہ پولیو ویکسین کے قطروں میں ایسی دوائی شامل ہے جو قطرے پینے والوں کو اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتی ہے۔ یہ ایک طرح سے مسلمانوں کی نسل کشی ہے۔ اس فتوے کا جاری ہونا تھا کہ پولیو ورکرز پر جان لیوا حملے شروع ہو گئے وہ بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کے عروج کے دور میں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب تک پاکستان میں پولیو کے وائرس پر قابو نہیں پایا جا سکا۔ یہ وائرس کسی بھی وقت وبا کی شکل میں پھیل کر پوری دنیا کے بچوں کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔

ساری دنیا نے ہماری عزت افزائی اس طرح کی ہے کہ کسی بھی پاکستانی کو خواہ وہ وزیر اعظم ہی ہو کسی دوسرے ملک کے ائیر پورٹ پر پولیو کے قطرے پلائے جاتے ہیں۔

مابعد الطبیعات، ماورائیت اور بنیاد پرستی کا حملہ بھی انسانی ذہن کی ابتدائی نشوونما اور خیالات کے تشکیلی دور تک یعنی پانچ سال میں ہوجاتا ہے جس سے سارا سماج ہی فکری جمود کا شکار ہوجاتا ہے۔ فلسفہ مادیت سماج کو فکری طور پر اپاہج اور معذور بنانے والے وبائی خیالات کی ویکسین ہے فلسفہ مادیت کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جاتا ہے جو پولیو ویکسین کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

ریاست نے آئیڈیالوجی کے نام پر تعلیمی نصاب کو مابعد الطبیعات اور ماورائیت کو حقیقت کا علم قرار دے کر جس طرح کی ذہن سازی کی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم زہر کو تریاق سمجھ کر اور تریاق کو زہر سمجھنے پر فخر کرنے والی قوم بن گئے ہیں۔

فلسفہ مادیت

جس طرح چھوٹے چھوٹے ندی نالے مل کر ایک دریا بناتے ہیں اس طرح چھوٹے چھوٹے تصورات ملکر سوچ کا ایک دھارا بناتے ہیں۔ مادیت پہلے دن ہی سے کوئی فکری نظام نہیں تھا، چھوٹے چھوٹے سادہ سے حقائق پر مبنی خیالات سے مادیت کی ابتدائی ہوئی۔

مادے لفظ سے تو ہم بچپن ہی میں اس وقت آگاہ ہو جاتے ہیں جب ہم چھٹی کلاس کی سائنس کی کتاب میں پڑھتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو وزن رکھتی، جگہ گھیرتی ہے مادہ کہلاتی ہے پھر سائنس کے استاد ہمیں اردگرد کی مثالیں دے کر سمجھاتے ہیں کہ انسان، حیوان، دریا، پہاڑ ہماری زمین، سورج، چاند ستارے کہکشاں سب مادہ ہیں، کلاس روم میں جو جو چیز آپ کو نظر آ رہی ہے مادہ ہے۔ بلکہ نظر نہ آنے والی ہوا بھی جگہ گھیرتی، وزن رکھتی ہے وہ بھی مادہ ہے کائنات کو تو انسان نے نہیں بنایا لیکن انسان جو کچھ بھی تخلیق کرتا ہے وہ بھی مادے ہی کو استعمال میں لا کر تخلیق کرتا ہے۔ جیسے گھر کا فرنیچر، پنکھا، موبائل، گاڑی، گھر اور جو بھی انسانی تخلیق ہے وہ بھی مادے ہی سے کی گئی ہے۔

سب سے پہلی حقیقت جو ابتدائی زمانے کے مادئین کے ذہن میں تھی وہ یہ کہ مادے کا وجود اپنے آپ میں قائم ہے۔ مادہ اپنے وجود کے لیے کسی دوسری چیز کا محتاج نہیں جیسے بلبلہ یا لہریں اپنے وجود کے لیے پانی کی محتاج ہیں۔ اسے کہتے ہیں مادہ قائم بالذات ہے۔ اس کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں کسی چیز کا قائم بالذات ہونا اور کسی چیز کا اپنے وجود کے لیے کسی دوسری چیز پر منحصر ہونا کیسا ہے۔

ایک شخص کہتا ہے کہ "میری خواہش تھی کہ اس سال حج پر جاتا۔ ارادہ تو پچھلے سال بھی کیا تھا

مگر کاروباری شراکت داروں کی رقابت اور ان کے لالچ کی وجہ سے میں نے ان پر اعتماد نہیں کیا اور ان سے علیحدگی اختیار کر لی۔ جس سے مجھے نقصان ہوا پھر ذمہ داریاں اتنی بڑھ گئیں کہ خواہشات دھری کی دھری رہ گئیں یا حسرتوں میں تبدیل ہو گئیں۔

اس بیان میں کچھ ایسی چیزوں کے نام ہیں جو مادی نہیں ہیں۔ عمومی طور پر ہم مادی چیزوں کی پہچان کے لیے نام رکھتے ہیں لیکن یہ چیزیں جن کے نام اس بیان میں ہیں وہ جذبات، احساسات تصورات اور تخیلات ہیں۔ جیسے (۱) خواہش (۲) ارادہ (۳) رقابت (۴) لالچ (۵) اعتماد (۶) ذمہ داریاں (۷) حسرتیں یہ سات ایسی چیزیں ہیں جن کو الگ الگ ہونے کی وجہ سے الگ الگ نام دیئے گئے ہیں۔ جس طرح آپ مادی چیزوں کو دیکھتے ہیں اور ان کی الگ الگ پہچان کر لیتے ہیں۔ درخت اور ٹرک کو آپ دیکھ کر الگ الگ پہچان سکتے ہیں کیونکہ ان کا مادی وجود ہے۔ لیکن آپ حسرت اور ذمہ داری کو دیکھ کر الگ الگ پہچان نہیں کر سکتے کیونکہ ان کا مادی وجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ ہمارے دماغ ہی میں موجود ہوتی ہیں ہم ان کو محسوس کر سکتے ہیں۔ سوچ سکتے ہیں ان کا وجود دماغ سے باہر ممکن نہیں۔ ان کے وجود کے لیے زندہ اور تندرست دماغ یا ذہن کی ضرورت ہے، تصورات قائم بالذات نہیں ہوتے ان کے وجود کے لیے ذہن کی محتاجی ہوتی۔ جس شخص کا بیان ہم نے اوپر درج کیا ہے وہ شخص فوت ہو جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس شخص کی خواہش، حسرتیں اور ارادے اس کے ساتھ ہی دفن ہو گئے۔ یہ چیزیں اس کے ذہن سے الگ نہیں کی جا سکتی تھیں۔

البتہ اس شخص کی معمولی سی عینک، دکان کی چابی اور سائیکل اب بھی موجود ہیں۔ یہ تینوں مادی چیزیں تھیں۔ ان کا اپنا وجود ہے جو اس کے ذہن کا محتاج نہیں۔ مادہ اپنے وجود میں خود قائم ہے۔

مادہ قائم بالذات ہے اس حقیقت کو کچھ لوگوں نے ایک دوسرے زاویے سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مادہ ہمارے ذہن کے باہر اپنا آزاد وجود رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ سوچیں تو ہے نہ سوچیں تو نہیں ہے۔ جیسے اگر آپ نے امریکہ نہیں دیکھا تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ امریکہ ہے ہی نہیں۔ کئی ستارے ایسے ہیں کہ جن کی روشنی ہماری زمین تک ہزاروں سال سفر کرنے کے بعد پہنچتی ہے ان کا پتہ ھبل ٹیلی سکوپ سے لگایا جاتا ہے۔ ھبل ٹیلی سکوپ کے ایجاد ہونے سے پہلے بھی وہ موجود تھے مگر معلوم نہیں تھے۔

بہت سے لوگ پیدائشی اندھے ہوتے ہیں مگر دنیا ان کے نہ دیکھنے کے باوجود موجود ہوتی ہے لاکھوں لوگ پیدائشی بہرے ہوتے ہیں مگر مادے سے پیدا ہونے والی آوازیں ان کے نہ سننے کے باوجود موجود ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ سورج کی سطح پر ہر وقت ہائیڈروجن بم کے پھٹنے جتنے دھماکے ہوتے رہتے ہیں مگر صحت مند کان رکھنے والے لوگ بھی کروڑوں میل کی دوری اور راستے میں خلا کی وجہ سے نہیں سن پاتے تو اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ دھماکے ہو نہیں رہے۔ ایک شخص قومہ میں چلا جاتا ہے مگر اس کے اردگرد کی دنیا رواں دواں رہتی ہے۔ اگر کچھ سال بعد اس کو ہوش آ جائے تو اس کے اردگرد کی دنیا بدل چکی ہوتی ہے۔ مادے کا وجود ہمارے حواس اور معلوم ہونے کی شرط سے آزاد ہے۔

مادے کے بارے میں یہ حقیقت بھی ہزاروں سال پہلے عیاں ہو چکی تھی کہ مادہ جذبات و احساسات سے عاری ہے۔ مادے کو نہ کسی شے کی خوشی ہوتی ہے نہ غم۔ مادہ نہ کسی شے سے ہمدردی رکھتا ہے نہ دشمنی۔ نہ کسی چیز پر رحم کھاتا ہے نہ کسی کو مقدس سمجھتا ہے۔ یہ سب انسانی اوصاف ہیں انسان یہ سمجھتا ہے کہ شاید یہی اوصاف مادی کائنات میں بھی ہیں۔ انسان کے ایسا سمجھنے کی وجہ در اصل وہ من گھڑت کہانیاں، فرضی قصے، قیاسی روایات اور جھوٹے افسانے ہیں جو پیشواؤں نے لوگوں میں خوف پیدا کرنے کے لیے گھڑے ہیں۔

اس مرحلہ پر میں اپنے بچپن کے دو واقعات بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن کے سننے کے بعد ان سے اخذ کردہ نتائج سے جان چھڑوانی میرے لیے کتنی مشکل تھی۔ ایسے واقعات میرے اکیلے کے ساتھ پیش نہیں آئے ہوتے۔ اس قسم کے واقعات میرے طبقے سے تعلق رکھنے والی پاکستان کی 99 فیصد آبادی کے بچوں نے اپنی عمر کے اس حصے میں سنے ہوئے ہیں جو ان کی ذہن سازی کا زمانہ ہوتا ہے۔ بیان کرنے والے ایسے واقعات کو ایسا پرکشش بنا کر بیان کرتے ہیں کہ بچے ان کو حقیقت سمجھ کر اپنے ذہن میں بٹھا لیتے ہیں۔

3 سے 10 سال کی عمر تک کا زمانہ بچوں کے لیے ذہن سازی کا زمانہ ہوتا ہے۔ بچے دنیا و کائنات کو سمجھنے کا اپنی زندگی کا نظریہ بنا رہے ہوتے ہیں۔ اپنا نقطہ نظر قائم کر رہے ہوتے ہیں چیزوں کو پرکھنے کا معیار تشکیل دے رہے ہوتے ہیں۔ من گھڑت واقعات اور فرضی کہانیاں ان کے سامنے اتنے وثوق سے بیان کی جاتی ہیں جیسے یہ سچ ہوں۔ یہ کہانیاں بچوں میں غلط یا صحیح کے

لیے معیار قائم کر دیتی ہیں پھر ساری زندگی بچے ان کہانیوں کے بنائے معیار پر صحیح یا جھوٹ کو قبول یا مسترد کرتے رہتے ہیں۔

بچوں کو اپنے بڑوں پر اعتماد ہوتے کی وجہ سے ان سے سنائے واقعات پر یقین ہوتا ہے وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان کے بڑے ان کے ساتھ دھوکہ کر رہے ہیں۔ اس عمل میں نئی نسل کے ذہنوں میں مابعد الطبیعاتی رجحانات پروان چڑھائے جاتے ہیں۔ ذہن سازی کے اس دور میں ایک بار دماغ جس سانچے میں ڈھل جاتا ہے یا مقفل ہو جاتا ہے تو سمجھ لیں کہ باقی زندگی کے لیے تازہ فکر یا نئی سوچ کے لیے اس کے ذہن کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے۔ تازہ فکر یا نئے خیالات کے لیے ذہن کے دریچے بند رکھنے کو ہم استقامت کہتے ہیں اور ساری عمر دعائیں مانگتے ہیں کہ ہم استقامت قائم رکھیں۔

یہ دو واقعات جو میں بیان کرنا چاہتا ہوں ان کا انتخاب میں نے ان تمام ایسے واقعات میں سے کیا ہے جو میرے ذہن میں اس طرح براجمان تھے کہ جب بھی میں سائنسی حقائق کو سمجھنا چاہتا یا مادیت کا فلسفہ پڑھتا تو یہ واقعات اور ان سے اخذ شدہ نتائج عقل اور شعور کے راستے میں دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے۔ ان واقعات سے اخذ کردہ نتائج کی بنیاد پر میں روشنی دینے والے خیالات کے چراغوں کو پھونک مار مار کر بجھاتا رہتا اور اس پر خوشی بھی محسوس کرتا۔

واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی دادی کے ساتھ بہاولپور کے قریب ایک گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ سردیوں کا موسم تھا اور یوم عاشور تھا۔ پیر صاحب یوم عاشور کے معجزات بیان فرما رہے تھے بیان سننے کے بعد بہت سے لوگ اکٹھے واپس آ رہے تھے کہ ایک شخص کی نظر سامنے مسجد کے میناروں پر پڑی تو اس نے چونک کر کہا کہ دیکھو دونوں مینار غم کی وجہ سے اندر کو جھکے ہوئے ہیں اور سب نے دیکھ کر اس کی تائید کی۔ سہ پہر کا وقت تھا سردیوں کی سہ پہر سورج کے زاویے کی وجہ سے ویسے ہی غمگین ہوتی ہے۔ اگلے دن سب لوگ کہہ رہے تھے کہ مینار اب سیدھے ہو کر اپنی اصل پوزیشن پر آ گئے ہیں۔

دوسرا واقعہ بھی اس طرح کا ہے۔ میرے بڑے بھائی ایک پیر صاحب کے خلیفہ تھے۔ وہ اپنے پیر کے ہاں بیٹے کی پیدائش کو اس طرح بیان کرتے تھے کہ سخت گرمی کا موسم تھا۔ ان دنوں سورج آگ برسا رہا تھا۔ چرند پرند گرمی کی حدت سے درختوں میں خاموش دبکے بیٹھے تھے کہ

اچانک آسمان پر سیاہ بادل رونما ہوئے ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنا شروع ہو گئی۔ پرندے چہچہانے لگے جیسے کسی کی آمد کے استقبال کے گیت گا رہے ہوں۔ اچانک فضا خوشبو سے معطر ہو گئی۔ اتنے میں خادمہ حویلی کے بڑے دروازے پر نمودار ہوئی اور مبارکباد دیتی ہوئی بولی کہ بیٹا ہوا ہے۔

اس طرح کے کئی اور واقعات جو ہماری فکری تشکیل میں پھنسے ہوتے ہیں وہ ہم نے کبھی دیکھے نہیں ہوتے بس سنے ہوتے ہیں۔ ان واقعات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مادی دنیا و کائنات کی ہر شے انسان کو واہمہ نظر آتی ہے۔ مابعد الطبیعاتی قیاسات اور ماورایت کی کہانیاں آپ کو کبھی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے نہیں دیتی۔

دیوی دیوتاؤں کے اس دور میں جب مادئین نے مابعد الطبیعاتی قیاسات کو جھٹلایا تو ان کا سب سے پہلا دعویٰ یہ تھا کہ مادہ ایک ٹھوس اور پائیدار حقیقت ہے، یہ کوئی واہمہ نہیں۔ مادہ قائم بالذات ہے۔ ناقابل فنا ہے۔ دوامی ہے۔ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔

مادہ کے بارے میں حقائق کو جاننے اور مشاہدہ پر یقین رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مابعد الطبیعاتی کہانیوں سے پیدا عدم یقین اور خوف ختم ہوتا گیا اور انسانوں میں اعتماد پیدا ہوا جن لوگوں نے مادہ کو اول حقیقت جانا خیال کو قیاس کو ثانوی ان کے خیالات سے مادیت کی ابتدا ہوئی۔

کلاسیکی مادیت

یہ زمانہ دیوی دیوتاؤں کے عروج کا زمانہ تھا۔ عالم غیب سے متعلق مذہبی پیشواؤں کی فراہم کردہ معلومات پر یقین کرنے کی وجہ سے انسان خود کو لاچار محسوس کرتے تھے۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ عدم یقین کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ مذہبی پروہتوں نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ اچانک کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ دریاؤں کا پانی ڈھلوان کی طرف بہتے بہتے اچانک پہاڑوں کی بلندیوں پر چڑھنا شروع ہوسکتا ہے۔ پتھر جیسی وزنی چیزیں اپنا وزن کھو کر ہوا میں اڑنا شروع کر سکتی ہیں۔ رات ہمیشہ کے لیے رہ سکتی ہے۔ سورج کہیں دریا میں ڈوب کر ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہوسکتا ہے۔ پروہتوں کا من گھڑت کہانیوں کے ذریعے پیدا کردہ عدم یقین لوگوں کو عدم تحفظ کے خوف میں مبتلا رکھتا تھا۔ غیر محفوظ ہونے کا خوف پروہتوں کے وسیلے سے دیوتاؤں کی پناہ میں رہنے پر بنی نوع انسان کو آمادہ کرتا تھا۔

خوف کی بنیاد وہ من گھڑت کہانیاں تھیں جنہیں پروہت باطنی دنیا کی معلومات کے طور پر پیش کرتا تھا۔ تباہ کن بارشوں، سیلاب اور زلزلوں کو تو وہ ایک منصوبہ بندی کے تحت لوگوں میں عدم اعتماد، عدم تحفظ اور خوف پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتا ہی تھا وہ روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے حادثات سے بھی خوف پیدا کرنے کا پہلو نکال لیتا۔ عالم غیب کے بارے میں فلاں شخص کے ذہن میں شک پیدا ہوا ہی تھا کہ پورا درخت اس کے اوپر آ گرا اور وہ موقع پر ہی مر گیا۔ خوف کے غلبے نے لوگوں میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کچل دی تھیں۔

دیوی دیوتاؤں کے عروج کے اس زمانے میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو پروہتوں اور پیشواؤں کی عیاریوں سے نالاں تھے اور باطنی دنیا سے متعلق ان کی فراہم کردہ معلومات کو ان کی مذہبی دکانداری چمکانے کا ذریعہ سمجھتے تھے اور ان معلومات کو محض قیاس آرائیاں خیال کرتے تھے۔

ان حقیقت پسند اور نڈر لوگوں نے مذہبی لوگوں کی طرف سے خوف اور بے یقینی کی فضا کو ختم کرنے کے لیے لوگوں میں مادیت کے علم کے ذریعے اعتماد اور بھروسہ پیدا کیا۔ ان کا ماننا تھا کہ مادی کائنات ان کی آنکھوں کے سامنے ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ اگر دریا ہے تو سبھی کو دریا ہی نظر آتا ہے۔ اگر پہاڑ ہے تو سبھی کو پہاڑ ہی نظر آتا ہے۔ گلاس کو سبھی لوگ گلاس ہی دیکھتے ہیں ایسا نہیں ہے گلاس کسی کو کتاب نظر آئے اور کچھ دوسرے لوگوں کو گلاب کا پھول۔ مادہ چونکہ قابل مشاہدہ ہے سب کو ایک جیسا ہی نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس نظروں سے اوجھل۔ عقل سے ماوراغیب اور باطن کے متعلق آپ محض قیاس آرائی کر سکتے ہیں۔ یہ قیاسات ہر انسان کے الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ مادئین کے نزدیک مادہ ہی وہ حقیقت ہے جو موجود ہے اور اس کے متعلق علم ہی انسان کو بے جا خوف سے نجات دلا سکتا ہے۔

ایسے پراعتماد اور بہادر لوگوں نے اپنی فکر کی بنیادیں قائم کرنے کے لیے دو اصول طے کیے پہلا یہ کہ مادہ ہی حقیقت مطلقہ ہے۔ مادہ ناقابل فنا ہے۔ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ اس کا علم حاصل کرنا انسان کو ماورائی کہانیوں کے پیدا کردہ خوف سے نجات دلا سکتا ہے۔

دوسرا اصول یہ کہ مادہ چونکہ حقیقی وجود رکھتا ہے اور قابل مشاہدہ ہے۔ دوسری طرف ہمارے پاس حواس ہی وہ ذریعہ ہیں جو بیرونی دنیا کی معلومات ہمارے دماغ کو فراہم کرتے ہیں اور ہمارا دماغ ان معلومات سے جو نتائج اخذ کرتا ہے۔ یہی معلومات علم کہلانے کی حقدار ہیں نہ کہ قیاس آرائیاں۔

آسانی سے سمجھ میں آجانے والے ان سادہ خیالات کو کلاسیکی مادیت کہا جاتا ہے۔ کلاسیکی مادئین کے دعوے روزمرہ زندگی کے عمومی مشاہدے سے اخذ کیے ہوئے نتائج تھے۔ تب مادیت دو پہلوؤں پر منحصر تھی۔ ایک فلسفیانہ پہلو دوسرا عملی۔

فلسفیانہ پہلو یہ کہ ایک شخص ان معنوں میں مادیت پسند ہو کہ وہ مادے ہی کو حقیقت مطلقہ سمجھے۔

عملی پہلو یہ کہ وہ زندگی کو مادی پروسیسوں کا نتیجہ سمجھے۔ اس لحاظ سے ہر شخص مادیت پسند ہے کہ یہ عقیدہ رکھتے ہوئے بھی کہ انسان روح کی وجہ سے زندہ ہے۔ روح ایک غیر مادی شے ہے روح عالم باطن سے اس کے مادی جسم میں آئی ہوئی ہے۔ عملی طور پر وہ سانس لیتا ہے تاکہ آکسیجن

جو کہ ایک مادی شے ہے وہ اس کے خون میں شامل ہو۔ اگر وہ سانس نہ لے گا تو روح جسم سے فرار ہو جائے گی۔ وہ کھاتا ہے پیتا ہے جسم کو مادی چیزوں کی خوراک مہیا کرتا ہے تاکہ غیر مادی روح اس کے جسم کا حصہ رہے۔ جسم میں کیمیائی مادوں کی کمی بیماری کا باعث بنتی ہے اور یہ بیماری موت کا باعث بن سکتی ہے۔ اس لیے وہ ادویات کی صورت میں کیمیائی مادوں کی کمی کو پورا کرتا ہے۔

دماغ میں آیوڈین کی مقدار کی معمولی سی کمی آپ کے خیالات کو منتشر رکھ سکتی ہے۔ خون میں آئرن کی معمولی سی کمی آپ کو تھکاوٹ اور بے بسی کی کیفیت میں مبتلا رکھ سکتی ہے۔ کیلشیم کی تھوڑی سی کمی آپ کی ہڈیوں کو کھوکھلا کر سکتی ہے۔ پانی ختم ہو جانے سے آپ کی روح جسم سے پرواز کر سکتی ہے۔ کوئی بھی انسان کسی طور پر مادی پروسیسوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ جس کی وجہ سے انسان عملی طور پر مادیت پسند ہوتا ہے۔

مابعد الطبیعات کے متعصب پیروکاروں نے عملی زندگی کے مادی پہلوؤں کے بیان سے گمراہ کن نتائج اخذ کیے ہیں کہ مادیت تو بس کھاؤ۔ پیئو اور عیش کرو کا نام ہے۔ اصل زندگی روح کی پاکیزگی ہے۔ جو کھانے پینے اور سونے میں کمی کر کے حاصل ہوتی ہے، اس سلسلے میں دنیا کے تمام مذاہب نے اپنی اپنی مقدس ہستیوں کے بارے میں ایسی ایسی کہانیاں منسوب کیں کہ فلاں نے کئی سال دم کشی کی یعنی سانس بند رکھا۔ فلاں نے 24 سال کھائے پیے گزار دیے وغیرہ۔

قدیم زمانے میں جب ساری دنیا میں شاہراہیں، سنگ میل، راہ کی مشعلیں یہاں تک کہ پگڈنڈیاں بھی نہیں ہوتی تھیں تب بھی لوگ دور دراز کا سفر طے کیا کرتے تھے یہ سفر زیادہ تر تجارتی ہوا کرتے تھے۔ ایسے میں لوگ سمت کا تعین اور اپنا راستہ کیسے تلاش کیا کرتے تھے؟ یہ لوگ ستاروں سے رہنمائی لیتے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ ستارے مخصوص گذرگاہوں سے گزرتے ہیں بعد میں سمندری سفر بھی انہی ستاروں کی رہنمائی میں طے کیے جاتے تھے۔ لوگ صدیوں کے تجربے سے یہ جان گئے تھے ستاروں کی گردش میں ہمیشہ ایک باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ اس باقاعدگی سے ان کے ذہن میں مادی کائنات کے متعلق ایک تاثر ابھرتا تھا۔ ہزاروں سال پہلے انسان نے سورج کے گرد زمین کے ایک چکر پورا کرنے کا صحیح صحیح حساب لگا لیا تھا۔ جس کو کیلنڈر کی شکل بھی دے دی تھی۔ یہ گردش اتنی اٹل اور باقاعدہ تھی وہ آنے والے وقتوں کا کیلنڈر بنانے پر بھی دسترس حاصل کر چکے تھے۔

مادی کائنات کی حرکت میں باقاعدگی کو دیکھ کر کلاسیکی مادئین نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مادی

کائنات کسی اصول، ضابطے یا قانون کے تحت چل رہی ہے۔ یہ لوگ انہیں مادی کائنات میں کار فرما اندھے قوانین کہا کرتے تھے۔ کلاسیکی مادئین اگرچہ یہ قوانین تو دریافت نہیں کر سکے مگر انہوں نے قوانین کی موجودگی کا بتا کر آنے والی نسلوں کے لیے رہنمائی چھوڑ دی ان کا کہنا تھا کہ مادی قوانین کہیں باہر سے لاگو نہیں ہوئے بلکہ مادے کی خصوصیات ہیں مادے کی ان خصوصیات کو دریافت کرنا ہی علم ہے۔

کلاسیکی مادئین کے نزدیک اگر کائنات مادی قوانین سے ذرہ بھر ادھر ادھر ہو جائے تو سارا سلسلہ کائنات بے ترتیبی کا شکار ہو کر تباہ ہو جائے۔ مادی کائنات میں موجود قوانین کے لیے وہ اندھے قوانین کا لفظ اس لیے استعمال کرتے تھے کہ ان کے زمانے میں بھی قدیم زمانے سے یہ تصور چلا آ رہا تھا مادی چیزیں بھی انسان کی طرح شعور اور روح کی مالک ہیں۔ وہ بھی انسانوں کی طرح جذبات و احساسات رکھتی ہیں۔ اس فکر کو روحیت (Animism) کہا جاتا تھا۔ روحیت بھی مادی چیزوں کے بارے میں انسان کی اپنی طرف سے قائم کردہ ایک رائے تھی۔

انسان سمجھتا تھا کہ سورج، چاند، ستارے، پتھر، دریا، پہاڑ درخت اور ارد گرد کی دنیا ایک گاؤں کی طرح ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ مادی چیزیں اگرچہ بول نہیں سکتی، سنتی ضرور ہیں یہاں تک کہ بات ہمارے دل میں ہوتی ہے انہیں پتہ چل جاتا ہے۔ ہماری باتوں پر مادی چیزوں کو غصہ بھی آتا ہے پیار بھی۔ یہ خود ساختہ خیال ان لوگوں کو اس قدر خوف میں مبتلا رکھتا تھا کہ ان کا ذہن ایسے کئی سوال ابھرنے سے پہلے ہی دفن کر دیتا تھا جن سوالوں کے جواب نے ان کے خوف پر قابو پانا ہوتا تھا۔

اس وقت کے لوگ یہ بھی سمجھتے تھے کہ مادی چیزیں ہماری طرح مقدس ہستیوں کا احترام کرتی ہیں۔ اس تاثر کو زائل کرنے کے لیے کلاسیکی مادئین مادے کو مردہ، جذبات و احساسات سے عاری، سننے اور سمجھنے سے محروم ثابت کرنے کے لیے اندھے قوانین کا لفظ استعمال کرتے تھے جس طرح ہم نے قانون کے بارے میں ایک جعلی تاثر قائم کیا ہے کہ قانون کی دیوی اندھی ہوتی ہے اور ہر ایک چھوٹے بڑے کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرتی ہے۔

ان تمام تر باتوں کا تقاضا یہ تھا کہ تسخیر مادہ کے ذریعے اب ان دعووؤں کو کیسے سچا ثابت کیا جائے۔ یونانی فلسفی ڈیموکرائٹس نے مادے کو سمجھنے کی پہلی تجربی کوشش کی۔ جس سے سائنس کا جنم

ہوا۔ تجربے سے جانور بھی سیکھتے ہیں مگر جاننے کے لیے خود تجربہ کرنا انسان کا خاصہ ہے ڈیموکرائٹس نے کسی مادی چیز کا ایک چھوٹا سا ڈھیلہ لیا۔ اسے لکڑی کے تختے پر رکھ کر تیز دھار آلے سے پہلے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ پھر چار اور اس طرح ہر ذرے کو مزید تقسیم در تقسیم کرنے کا عمل جاری رکھا۔ یہاں تک کہ ٹھوس ڈھیلہ پاؤڈر میں تبدیل ہوگیا۔ پھر اسنے پاؤڈر کا ایک ذرہ لیا اس کو کاٹنے کی کوشش کی لیکن وہ ذرہ اتنا چھوٹا تھا کہ مزید تقسیم ہونے کے قابل نہیں تھا۔ ایسا ذرہ جس کو مزید تقسیم نہ کیا جا سکے یونانی میں ایٹم کہلاتا ہے۔ ایٹم کا لفظی معنیٰ ہی نا قابل تقسیم ہے۔ ڈیموکرائٹس نے اس تجربے کے بعد یہ نظریہ قائم کیا کہ مادہ ایسے چھوٹے چھوٹے نا قابل تقسیم ذرات سے مل کر بنا ہے جنہیں ایٹم کہتے ہیں۔ اسی زمانے میں کائنات کی عنصری ترکیب کا نظریہ سامنے آیا۔ کہ یہ مادی کائنات کن عناصر سے مل کر بنی ہے۔ ویسے تو عنصر (Element) کا لفظی مطلب ہے حروف تہجی یا اجزاء۔ جیسے لفظ محبت کے چار حروف تہجی ہیں (م+ح+ب+ت) یہ چاروں حرف محبت لفظ کے اجزا ہیں۔ کائنات کے بارے میں کسی فلسفی نے کہا کہ یہ پانی سے بنی ہے۔ کسی نے کہا آگ سے۔ ایمپیڈوکلیز نے کہا کہ کائنات چار عناصر سے مل کر بنی ہے۔ پانی، مٹی، آگ، ہوا۔

اس زمانے کے بعد جب تک عناصر کا درست تصور نہیں آیا درمیانی عرصے کے تمام مذاہب نے بھی انہی چار عناصر کو کائنات کے اجزاء قرار دیا۔

مادی نظریہ علم

کلاسیکی مادئین تو بس اتنا جان پائے تھے کہ خیالات بھی مادے ہی کا عکس ہوتے ہیں۔ اگر آپ شیشے کے سامنے کھڑے ہوں تو شیشے میں آپ کا عکس نظر آ رہا ہوتا ہے۔ آپ مادی وجود رکھتے ہیں جبکہ آپکے عکس کا مادی وجود نہیں ہوتا۔ بس اتنا ہے کہ شیشہ کسی بھی مادی چیز کے عکس کو محفوظ نہیں کر سکتا جبکہ انسانی دماغ اپنی آنکھوں کے سامنے آنے والی ہر مادی چیز کے عکس کو محفوظ کر لیتا ہے اور پھر بہت سے عکس اکھٹے کر کے انہیں خیال کی شکل میں ڈھالتا ہے۔

کلاسیکی مادئین کا یہ خیال صرف ایک رائے تھی۔ حقیقت کیا ہے؟ اس پر آنے والے وقتوں میں کام ہونے والا تھا۔ جان لاک نے اس رائے پر کام کیا اور اسے باقاعد نظریہ علم کی شکل دی پھر سائنس نے اس رائے کو درجہ حقیقت تک پہنچایا۔

جان لاک نے ایک تحقیقی مقالعہ لکھا جس کا عنوان تھا ''فہم انسانی کے بارے میں انشائیہ'' اس مقالے میں اس نے علم کا مادی نظریہ پیش کیا جس کو فلسفے کی زبان میں تجربیت کہتے ہیں۔ جان لاک علم کے مادی نظریہ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے ''تو آیئے ہم انسانی ذہن کو ایک سفید کاغذ فرض کرتے ہیں۔ جو تمام خصوصیات سے خالی ہے۔ جو کسی بھی تصور کے بغیر کورا کاغذ ہے۔ پیدائش کے وقت انسان اپنے ذہن کو ایک کورے کاغذ کے طور پر لاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسانی ذہن کا یہ کورا کاغذ ساز و سامان سے کس طرح آراستہ ہوتا ہے۔ وہ وسیع مواد کہاں سے آتا ہے جو انسان کے ہر وقت مصروف اور لامحدود تخیل کو اس کورے کاغذ پر نقش کرتا ہے؟ آسان الفاظ میں یہ کہ علم و عقل کا سارا مواد کہاں سے مہیا ہوتا ہے؟ میں اسکا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا۔ تجربہ سے تجربہ و مشاہدہ ہی ہمارے علم کی اساس بنتا ہے اور علم بالآخر اسی سے اخذ ہوتا ہے''۔

جس انگریزی لفظ کا اردو ترجمہ "تجربہ" کیا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں تو لفظ کی وضاحت کی اتنی ضرورت پیش نہیں آتی البتہ اردو لفظ تجربہ وضاحت طلب ہے۔ تجربہ سے مراد حسیات کا عمل ہے ذہن اکیلا کچھ نہیں وہ اپنے ساتھ ایسے آلات رکھتا ہے جو بیرونی دنیا کی معلومات ذہن تک پہنچاتے ہیں۔ یہ آلات ہمارے حواس ہیں۔ حواس کے عمل کو حسیات یا مشاہدہ کہتے ہیں۔ اسی کو جان لاک نے تجربہ کہا ہے۔ ذہن حواس کی فراہم کردہ معلومات کو مدغم کر کے خیال کی شکل میں ڈھالتا ہے حواس کے وسیلے سے بیرونی مادی دنیا کے جو عکس ذہن کے کورے کاغذ پر محفوظ ہو جاتے ہیں ان کے آپس کے ملاپ سے جو نقش ابھرتا ہے وہ خیال ہوتا ہے۔ ذہن حسیات کے دریچوں سے دیکھنے پر مجبور ہے۔ ذہن کا کام صرف یہ ہے کہ وہ تاثرات و نقوش میں ربط و نظم پیدا کرے۔ خیال بننے کا عمل بیرونی تاثرات، مشاہدات اور تجربے سے تشکیل یا تحریک پانے والا اندرونی عمل ہے۔

ابتدائی انسان کے سادہ ترین خیالات جو اس نے اگلی نسل کو منتقل کیے اور اگلی نسل نے اپنی زندگی کے تجربات اس میں شامل کر کے اپنی اگلی نسل کو منتقل کر دیئے پھر اگلی نسل نے ان میں اضافہ کر کے اس سے اگلی نسل کو منتقل کیے۔ بتدریج یہ سلسلہ بڑھتا ہوا آج کے انسان کے پیچیدہ خیالات تک آ پہنچا ہے۔

انسان نے اپنے اردگرد کی مادی کائنات یا فطرت سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ زندگی کے سفر کی ابتدا بھی اس نے فطرت کی نقل کرنے سے کی ہے۔ پرندوں کو اڑتا دیکھ کر ہوا میں اڑنے کی جو خواہش انسان کے اندر پیدا ہوئی اس کا اظہار اس نے اڑن کھٹولے کی تصوراتی داستانوں میں ہزاروں سال پہلے کیا تھا۔ پھر سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسان کو اس خواہش کو ہوائی جہاز کی مادی شکل میں تبدیل کیا۔ آج انسان زمین کے مدار سے نکل کر راکٹ پر سوار دوسرے سیاروں کی طرف عازم سفر ہے۔

لوہے کے پانی میں ڈوب جانے کی خاصیت اور لکڑی کے پانی پر تیرنے کی خاصیت کے موازنے نے انسان کو اس قابل بنایا کہ آج اچھی خاصی آبادی کے ایک شہر کے جتنے بڑے بحری جہاز کو سطح سمندر پر تیرا سکے۔ یہ جو ہم پیمائش اور گنتی کے لیے اربوں، کھربوں اور اس سے بھی اوپر تک گننے پر دسترس رکھتے ہیں یہ سب اعشاری نظام کی وجہ سے ہے کہ آپ دائیں جانب صفر بڑھا

کر لامتناہی تک چلے جاتے ہیں۔ یہ اعشاری نظام ہماری دس انگلیوں پر بنا ہے۔ مادیت کے علمی نظریہ کے مطابق ہمارے خیالات مادی دنیا ہی کا عکس ہوتے ہیں۔ انسان مادی دنیا کے فریم ہی میں رہ کر سوچتا ہے اور جن چیزوں کے عکس اس کے دماغ میں محفوظ ہوتے ہیں ان ہی کو اجزا کے طور پر ملا کر نئی تخلیق کرتا ہے۔ اس سے باہر نکلنا اس کے بس میں ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ مادئین نے عالم باطن کو مادی دنیا ہی کا تصوراتی عکس قرار دیا ہے۔ وہاں کی دنیا کے نقش و نگار یہاں کی دنیا کے عکس کے طور پر کھینچے گئے ہیں۔

مادئین کے مطابق صرف سائنس ہی نہیں فلسفہ، آرٹ اور یہاں تک کہ شاعری بھی مادی دنیا ہی سے اپنا مواد لیتی ہے۔ بھگت کبیر جی کا ایک مشہور زمانہ شعر ہے۔

چلتی چکی دیکھ ، دیا کبیرا روء
دو پاٹن کے بیچ میں ثابت بچا نہ کوء

انسانی زندگی کے دکھوں کے اظہار کے لیے آٹا پیسنے والی چکی جیسی مادی چیز کی تشبیہ پر سبط حسن فرماتے ہیں کہ اس بول میں بھگت کبیر جی نے زمین اور آسمان کو چکی کے دو پاٹوں سے تشبیہ دی ہے جس طرح چکی کے دو پاٹوں میں گندم کا دانہ پستا ہے اس طرح انسان اپنی زندگی میں دکھ سہتا رہتا ہے۔ اگر کسی کو کبیر کے معاشرے کا علم نہ ہو تب بھی وہ یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ اس شاعر کا تعلق ایک ایسے دور سے تھا جب معاشرے میں چکی کا رواج عام تھا۔

پنجاب کے صوفی شعراء بلھے شاہ اور شاہ حسین نے انسان کو چرخے سے تشبیہ دی ہے۔ چرخہ دستکاری کے زمانے کے آلات پیداوار میں ہل کے بعد دوسری اہم شے تصور کیا جاتا تھا۔ چرخہ محنت کشوں کے گھر کا لازمی جزو تھا۔ اس زمانے میں چرخے کے مختلف پرزوں کے افعال کے ذریعے کسی بھی مابعدالطبیعاتی مسئلے کو سمجھنا آسان تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ مٹی کا چراغ پورے کرہ ارض پر ہر گھر کو روشن کیا کرتا تھا۔ بعد ازاں صوفیوں نے خاص طور پر ایرانی مابعدالطبیعات میں چراغ جسم اور روح کے تعلق کو سمجھانے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ ان کی نظر میں شعلہ روح اور چراغ جسم کی علامت تھے انہیں جوڑنے کے لیے ان کے درمیان روئی کی باتی تعلق قائم رکھتی ہے۔ انسانی جسم میں کبھی ایسا عضو تلاش کیا جاتا رہا۔ جو روح کے جسم کے ساتھ جوڑے رکھنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ یہ مسئلہ مابعد

الطبیعات کے میدان سے نکل کر علم الحیات کا موضوع بنا رہا۔ بیالوجسٹوں نے انسانی جسم میں ایسے عضو کی تلاش میں کئی سال لگا دیئے جو روح کو انسانی جسم میں پیوست رکھتا ہے۔ ابھی کچھ زیادہ دور کی بات نہیں علم کیمیا میں نئی دریافتوں کے باعث، مختلف عناصر کے ایٹموں کے درمیان کشش سے نئے مرکبات کا بننا ٹوٹنا اور پھر نئی ترکیب سے نئے مرکبات بننے سے زندگی کے نمود کا نظریہ ابھرا۔ جس کو میکانکی نظریہ حیات کہتے ہیں۔ اس نظریہ میں زندگی اور موت کو زمینی اور مادی حوالے سے بیان کیا گیا تھا۔ اس نظریہ کو پنڈت برج نرائن چکبست نے بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

زندگی کیا ہے ؟ عناصر کا ظہور و ترتیب

موت کیا ہے ؟ انہی عناصر کا پریشاں ہونا

آج کا انسان جس کائنات کو جانتا ہے وہ لاکھوں کہکشاؤں، اربوں ستاروں، کھربوں سیاروں اور دشاؤں میں پھیلے انہد خلا کا مجموعہ ہے جس کی حدود کو فہم وادراک میں لانا مشکل ہے۔ اس لامحدود کائنات کو انسانی فہم میں لانے کے لیے مقدس کتابوں میں آسمان کو چھت اور زمین کو فرش کہہ کر پکارا گیا ہے۔

یہاں تک کہ ہمارے جذبے و احساسات جن کا کوئی مادی وجود نہیں ہوتا انہیں بھی مادی چیزوں ہی کے حوالے سے سمجھنے میں مدد لی جاتی ہے۔ مثلاً آہنی ارادہ/دریا دلی۔

ابھی تک لوگ رائے اور حقیقت میں فرق نہیں کر پاتے تھے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ کسی چیز کے بارے میں ہماری رائے ایک الگ بات ہے اور حقیقت میں وہ چیز ہے کیا؟ وہ الگ ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ زمین ساکن ہے اور کائنات کا مرکز ہے۔ یہ ان کی رائے تھی۔ پتہ چلا کہ زمین نہ تو ساکن ہے نہ کائنات کا مرکز بلکہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے تو دن رات پیدا ہوتے ہیں اور زمین نظام شمسی کا ایک سیارہ ہے۔ جو سورج کے گرد گھومتی ہے یہ ایک ثابت شدہ سائنسی حقیقت ہے۔ اس طرح حقیقت ان کی رائے کے برعکس نکلی لوگ اپنی رائے ہی کو حقیقت سمجھتے تھے۔ اپنی رائے ہی کو حقیقت سمجھنا عقیدہ کہلاتا ہے۔

بچوں کے ذہن کی فکری تعمیر کے زمانے میں بچوں کو طرح طرح کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ بچوں کا کہانی سنانے والے پر غیر متزلزل یقین بچوں میں کہانی کے مندرجات کو سچ ماننے پر آمادہ کرتا ہے۔ بڑے ہو کر معاشرے میں عزت و احترام رکھنے والے لوگ، پڑھے لکھے مانے

جانے والے لوگ، وہ لوگ جن کی باتوں پر اعتبار کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ معتبر کہلاتے ہیں یہ اعتبار لوگوں میں ان کی باتوں یا ان کی طرف سے فراہم کردہ معلومات کو سچ تسلیم کرنے کے قابل بناتا ہے۔ مقدس ہستیوں سے منسوب باتوں کو تو اس قدر قابل یقین سمجھا جاتا ہے کہ وہ عقیدہ بن جاتی ہیں۔ ہزاروں سال تک شخصیات کی فراہم کردہ معلومات ہی انسانی علوم کا ذریعہ رہی ہیں۔

لیکن مادی نظریہ علم نے ایسے تمام شخصی ماخذوں کو مسترد کر دیا اور تجربہ کو علم کا واحد ذریعہ قرار دیا۔ سولہویں اور سترہویں صدی تک یہ نظریہ عام تھا کہ کائنات میں پائی جانے والی تمام تر دھاتوں کا باطن سونا ہے۔ اس میں مختلف آلائشیں مختلف مقداروں میں ملی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے سونا مختلف دیگر دھاتوں کا روپ دھار لیتا ہے۔ اگر ان ملاوٹی لوثوں کو کیمیائی طریقے سے جلا کر ختم کر دیا جائے تو باقی جو کچھ بچے گا وہ سونا ہوگا۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اگر تانبے کو پگھلا کر اس پر آرسنک کا تیل ڈال کر اس کی لوثیں جلائی جائیں تو تانبہ سونا بن جائیگا۔ لوگوں نے صدیوں اس پر تجربے کئے مگر ناکام رہے۔ جس کی وجہ سے انہیں یہ نظریہ مسترد کرنا پڑا۔ کسی بھی سائنسی نظریہ کی سچائی جاننے کے لیے تجربہ لازمی قرار پایا، کلاسیکی مادئین کی دلچسپیاں فکری تھیں اس لیے وہ فلسفی کہلائے۔ علم کے مادی نظریے کے بعد جب تجربہ کسی رائے یا نظریے کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار قرار پایا تو مادئین کی سرگرمیاں تجربی ہو گئیں اس لیے تجربی مادئین سائنسدان کہلاتے ہیں۔ اب علوم کے درمیان ایک واضح تقسیم ہو گئی۔ علم کے مادی نظریئے کے مطابق تجربے اور مشاہدے سے حاصل کی گئی مادی دنیا کے قابل تصدیق معلومات ہی علم کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس کے برعکس کوئی مقدس سمجھی جانے والی ہستی، مافوق البشر صلاحیتیں رکھنے والی شخصیت یا کسی اتھارٹی کی طرف سے فراہم کردہ ناقابل تصدیق معلومات کو ان کا قیاس ہی سمجھا جائے گا۔

اس وقت تک دنیا کے ہر علم پر افلاطون کو ایک اتھارٹی تسلیم کی جاتا تھا۔ ہر وہ بات سچائی کا معیار تھی جو افلاطون نے کہی۔ افلاطون کے نزدیک ذہانت چند مخصوص لوگوں کو عطا کی جاتی ہے یہی لوگ حقیقت کا ادراک کر سکتے ہیں۔ جن کے پاس پیدائشی صلاحیت ہوتی۔

مادی نظریہ علم کے بعد افلاطون کے اس نظریے کو تھامس ہابس نے مسترد کر دیا اس کے مطابق انسانی عقل پیدائشی نہیں ہوتی، ماحول اس کے ذہن پر تاثرات نقش کرتا ہے پھر مشق اور تجربہ سے اس کی عقل ترقی کرتی ہے۔

مشینی مادیت

18ویں صدی کے سائنسدان ان تمام ہیئیوں پر کام کر رہے تھے جن کو وہ مادے کی ایک شکل سمجھتے تھے حیات ارضی پر تحقیق الگ سے ہو رہی تھی۔ مادے کی ساخت کو سمجھنے کے لیے مادے کی اندرونی توڑ پھوڑ جاری تھی۔ ساٹھ سے اوپر نئے عناصر دریافت ہو چکے تھے۔ جس کے بعد چار عناصر والا نظریہ دم توڑ گیا تھا۔ عناصر کے علاوہ قدرتی طور پر پائے جانے والے نئے مرکبات دریافت ہو رہے تھے۔ ان مرکبات کی ساخت پر کام ہو رہا تھا۔ مختلف عناصر کے ایٹموں کے درمیان ملاپ کی کشش کی ریاضیاتی پیمائش ہو رہی تھی۔

بہت سی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد بھی سائنس ابھی تک فطرت کا فلسفہ کہلاتی تھی۔ نیوٹن نے اپنی دریافتوں کو اپنی کتاب ''فطرتی فلسفے کے ریاضیاتی اصول'' میں پیش کیا۔ فطرت کے مطالعے کے شعبوں کی کثرت کے باوجود سائنس کی وحدت موجود تھی۔ اس وحدت کی بنیاد ریاضی کا علم تھا اس وقت یہ رواج اتنا غالب تھا کہ تجربے کے جن حصوں کی اس زمانے میں ریاضی سے تحلیل ممکن نہ تھی انہیں نظرانداز کر دیا جاتا تھا۔

پہیہ جس کی بنیاد پر ٹیکنالوجی کو عروج حاصل ہوا بذات خود ایک سادہ ترین مشین ہے۔ دائرے میں حرکت بھی پہیے ہی کی نسبت سے مشینی خیال کی جاتی ہے۔ قدیم و جدید سائنس دان مادی کائنات کو سمجھنے کے لیے فلکیات کے مطالعہ میں مصروف رہتے تھے کہ اس دوران گلبرٹ نے مقناطیس کا مطالعہ پیش کیا تو یہ تصور عام ہو گیا کہ کشش ایک فاصلے سے بھی ہو سکتی ہے۔ گلبرٹ کا کہنا یہ تھا کہ ممکن ہے یہ مقناطیسی کشش ہو جو سیاروں کو اپنے مقام پر رکھتی ہے اور ان کو ان کے مدار میں گھماتی ہے۔ یہ وہی زمانہ تھا کہ جب تک اس قسم کے عمومی تصورات کو ریاضیاتی اصولوں پر نہ

پرکھا جائے اور مشاہدے کے ذریعے اس کی تصدیق نہ ہو جائے معاملہ آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔

گیلیو، کیپلر، ہیوگنز سب نے اس پر کام کیا مگر بہت سے ہاتھوں اور ذہنوں کی محنت کے بعد فیصلہ کن کامیابی نیوٹن کے ہاتھ آئی وہ سادی میکانیات کے ریاضیاتی اصول وضع کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت تک یورپ کی سماجی زندگی دستکاری کے دور سے نکل کر مشین کے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ مشین ہر گھر کا اہم جزو بن گئی ہوئی تھی۔ نیوٹن کی میکانیات کے بعد مادی کائنات کا تصور ایک مشین کا سا بن کر ابھرا جس میں ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ حرکت کر کے پوری مشین کو چلانے کا سبب بن رہا ہوتا ہے۔

دوربین پہلے ہی گلیلیو کے ہاتھوں میں ستاروں کا بھید آشکار کرنے کا سبب بنی تھی اب خوردبین نے چھوٹی مخلوقات کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ ہاروے نے جو بات منطقی طور پر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ خون گردش کرتا ہے دل کے ایک سوراخ میں داخل ہوتا اور دوسرے سے نکل جاتا ہے اور پھر واپس لوٹ آتا ہے۔ اب ہاروے کا گردش خون کا نظریہ تجرباتی تصدیق کے مرحلے سے گزر کر سائنسی حقیقت بن گیا تھا۔ ہاروے نے انسانی جسم کی میکانیات کو اس طرح بیان کیا کہ ''دل کو انسانی جسم میں وہی مقام حاصل ہے جو سورج کو کائنات میں حاصل ہے۔ انسانی جسم ایک مشین ہے اور اعضا اس کے پرزے ہیں، آنکھ کے مطالعے نے کیمرے کی ایجاد کو ممکن بنا کر آنکھ کو بھی ایک مشین ثابت کر دیا تھا۔

مستریوں کی نئی مہارت نے اس قدر ترقی کر لی تھی کہ وہ سائنس کا علم حاصل کیے بغیر ٹیکسٹائل صنعت قائم کر چکے تھے۔ لیکن سٹیم انجن کی ایجاد سائنس کی ترقی ہی سے ممکن ہوئی۔ ہاتھ پر باندھنے والی گھڑی اب آٹومیٹک گھڑی ہو گئی تھی۔ مشین اب عام استعمال کی چیز ہو گئی ہوئی تھی۔ محنت کی تقسیم۔ محنت کی تنظیم کاری اور توانائی سے چلنے والی مشینری نے سماج کو مشینی دور میں داخل کر دیا تھا۔

خیالات میں پیش رفت اس زمانے کی عظیم تر تبدیلیوں کا براہ راست نتیجہ تھی، تجربی مادیت اب نظریات پر بھی اثر انداز ہو رہی تھی۔ جدید فلسفہ کے بانی بیکن اور ڈیکارٹ قدیم فکری کلاسیکی مادیت اور اٹھارویں صدی کی جدید مشینی مادیت کے موڑ پر کھڑے تھے، ڈیکارٹ نے کہا تھا کہ حیوانات خودکار مشینیں ہیں۔ لیکن ڈیکارٹ کے ایک جانشین ڈاکٹر لامتری نے انسان کو بھی ایک پیچیدہ مشین قرار دیا۔ اس نے کہا کہ میکانیات، طبیعات اور کیمسٹری کے اصول جتنے بے جان

چیزوں پر لاگو ہوتے ہیں اتنے ہی جاندار چیزوں پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔ مشین کے اس زمانے میں ہونے والی مادی تبدیلیوں کی بنیاد پر جس فلسفے کی تعمیر ہو رہی تھی اسے مشینی مادیت کہتے ہیں۔

نظام شمسی میں سیاروں کی دائروی حرکت سے مشینی مادیت نے جو اصول اخذ کیے ان کا پہلا اثر تاریخ کے متعلق نظریے پر پڑا۔ تاریخ کے بارے میں خیال پیدا ہوا کہ چونکہ دائرے میں حرکت کرنے والی چیز اپنا ایک چکر پورا کر کے واپس اسی مقام پر لوٹ آتی ہے جہاں سے اس نے شروع کیا تھا۔ اس طرح تاریخ بھی اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ یہ مشینی مادیت کے عبوری زمانے کا سچ تھا۔ انسانی علم و عقل نے جتنی ترقی کی تھی اس ترقی کی فکری حدود کا تقاضا یہی تھا کہ وہ تاریخ کے بارے میں ایسا تصور قائم کریں۔ اس تصور کو تاریخ کا مشینی تصور کہتے ہیں۔ چونکہ مشینی لفظ کا انگریزی تلفظ میکانکی ہے اس لیے بعض مفکروں نے اسے میکانکی مادیت کہا ہے۔

انسانی خیالات کے بارے میں بھی ایک ایسا ہی تصور وجود میں آیا اگرچہ یہ تصور اسی زمانے سے مخصوص تھا مگر بعد کی تحقیق اور اس تصور میں تبدیلی کے باوجود آنے والے وقتوں کے مفکرین کے لیے ابہام کا باعث بنتا رہا۔ یہ کہ ''تصورات کی حیثیت گہری لہروں کی سطح پر جھاگ کی سی ہے۔ یہ گہری لہریں مادی اور میکانکی اسباب کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس طرح فکر بھی مادی تبدیلیوں کی سطح پر بلبلے کی طرح ہوتی ہے۔''

برٹرینڈ رسل نے 18 ویں صدی کی فکری تاریخ بیان کرتے ہوئے مشینی مادیت کے تین اجزائے ترکیبی بیان کئے ہیں۔

(۱) مشاہدے سے حاصل شدہ قابل تصدیق حقائق ہی کو علم کا درجہ حاصل ہوگا۔ فطرت کو سائنسی طریقہ تحقیق ہی سے جانا جا سکتا ہے۔ حقائق کو جاننے کے لیے کسی ماورائی ہستی سے رجوع لانے کی ضرورت نہیں۔

(۲) مادی دنیا ایک خود کار مشین کی طرح ہے۔ جس میں تمام تغیرات طبیعی قوانین کے مطابق رونما ہوتے ہیں۔ مادی کائنات کی یہ مشین انسانی جذبات، احساسات اور خواہشات سے بے نیاز اٹل اندھے قوانین کے تابع رواں دواں ہے۔

(۳) زمین کائنات کا مرکز نہیں۔ یہ کائنات میں ایک بے وقعت سیارہ ہے۔ مادی کائنات سبب اور نتیجہ کے میکانکی قوانین میں بندھی ہے۔ پہلے سے طے شدہ کچھ نہیں۔

یونانی فکری غلبے سے چھٹکارہ

مشینی مادیت ایسا عبوری فلسفہ تھا جس نے فلسفہ و سائنس کو یونانیوں کے فکری غلبے سے آزاد کر دیا۔ یونانیوں نے سوچ کو جن طے شدہ خطوط اور متعین زاویوں میں قید کر رکھا تھا مشینی مادیت نے ان بندھنوں کو توڑ کر سوچ کی نئی جہتیں متعارف کروائیں۔

ارسطو کا خیال تھا کہ طبیعات کا علم دنیا کو سمجھنے کی کنجی ہے۔ مگر اس کی طبیعات آج کی طرح کی طبیعات نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر شے اپنے مقصد یا غایت کی طرف سفر کر رہی ہے۔ غایت کا مطلب ہے پہلے سے طے شدہ۔ ارسطو غایت کو ایک مثال سے اس طرح واضح کرتا ہے کہ شاہ بلوط کا ننھا سا بیج اکھوا بن کر دھرتی سے پھوٹتا ہے اس کی نشو و نما یا حرکت کا مقصد یہ ہے کہ وہ درخت بن جائے۔ مقصد و غایت ہی حرکت و تغیر کا اصل سبب ہے۔ جب کوئی شے حرکت میں آتی ہے یا تغیر پذیر ہوتی ہے تو کوئی چیز اسے پیچھے سے نہیں دھکیل رہی ہوتی بلکہ اس کا مقصد یا اس کی غایت سامنے سے اسے کشش کر رہی ہوتی ہے۔ لہٰذا مقصد یا غایت آغاز سے پہلے ہوگا اگرچہ وقت کے لحاظ سے وہ بعد میں آئے گا۔ یہ تھا وہ پہلے سے طے شدہ مقصد جس کو کسی بھی سائنسی تجربے سے پہلے تلاش کرنا لازمی سمجھا جاتا تھا۔ کئی تجربی شواہد کو غایت کے نام پر جھٹلا دیا جاتا۔ صدیوں سائنس کا راستہ ارسطو کی غایت نے روکے رکھا۔ ارسطو کے نظریات کو جھٹلانا مرتد ہونے کے برابر تھا۔ برونو کو بائبل کے جھٹلانے پر نہیں بلکہ ارسطو کے نظریات کو باطل قرار دینے پر اٹلی میں آگ کے شعلوں میں جلا دیا گیا۔ گلیلیو کی قید بھی دراصل ارسطو کے نظریات کو جھٹلانے کا نتیجہ تھا۔

مذہبی لوگوں نے ارسطو کی غایت کا بہت فائدہ اٹھایا۔ پادریوں کا کہنا تھا کہ خربوزے پر اس لیے نشان بنے ہوتے ہیں کہ خربوزے کی برابر قاشیں پورے فیملی میں تقسیم ہوں۔ آنکھوں کی پلکوں

پر بال اس لیے آگئے گئے ہیں کہ پسینہ آنکھ میں نہ گر پڑے۔ درمیان میں سے ناک اس لیے اونچی بنائی گئی ہے کہ عینک رکھنے میں آسانی ہو۔ غایت کی پاکستانی مثالیں جاننے کے لیے آپ کو کئی جمعے پڑھنے پڑیں گے تاکہ ان کے خطبوں میں غایت کی مثالیں جان سکیں۔

ارسطو کے نزدیک سائنسی جستجو کا مقصد ہر چیز کی غایت معلوم کرنا ہے۔ ہر کائناتی مظہر کی توضیع اس کے لیے ایک خاص مقصد قرار دے کر کی جا سکتی تھی۔ ارسطو کی غایت کا دائرہ مادی دنیا سے سماجی زندگی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے نزدیک پتھر نیچے کیوں گرتا ہے؟ اس کی ایک غایت ہے تو آدمی غلام کیوں ہے؟ اس کی بھی ایک غایت ہے جو پہلے سے طے شدہ ہے۔

اٹھارہویں صدی تک عام آدمی یہ بھی جاننے لگا تھا کہ زمین جب اپنے ہی محور کے گرد گھومتی ہے تو اس کے نتیجے میں دن اور رات پیدا ہوتے ہیں۔ زمین کا اپنے محور کے گرد گھومنا سبب ہے اور دن رات کا پیدا ہونا اس کا نتیجہ۔ زمین جب سورج کے گرد گھومتی ہے تو اس کے نتیجے میں موسم پیدا ہوتے ہیں۔ زمین کا سورج کے گرد گھومنا وہ سبب ہے جس کے نتیجے میں موسم تبدیل ہوتے ہیں۔

مختلف عناصر کے ایٹموں کے درمیان کشش وہ سبب ہے جس کے نتیجے میں کروڑوں، اربوں مرکبات وجود میں آتے ہیں۔ ماحول سے گرمی جذب کرنے کے سبب برف پگھل جاتی ہے پانی بن جاتی ہے۔ لیور اور گراریوں کی حرکت کے نتیجے میں گھڑی کی سوئیاں وقت بتاتی ہیں۔

شاہ بلوط کا بیج جب زمین میں بویا جاتا ہے تو پانی زمین سے نمکیات جذب کر کے بیج میں داخل ہوتا ہے جو بیج کو پھاڑ کر اکھوا کو باہر نکلنے کی توانائی فراہم کرتا ہے۔ پھر روشنی اور ہوا کی مسلسل دستیابی کے سبب اکھوا درخت بننے لگتا ہے اور بالآخر درخت بن جاتا ہے۔ اگر سلسلہ اسباب کسی مرحلے پر منقطع ہو جائے تو اکھوا درخت بننے کے آخری مرحلے تک کبھی نہیں پہنچ پائے گا۔ مشینی مادیت کی بنیادی فکر یہ تھی کہ یہ سلسلہ کائنات اور مظاہر فطری و سماجی، الغرض ہر چیز سبب و نتیجہ، علت و معلول کی میکانکی کڑیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اسباب مل کر نتیجہ پیدا کرتے ہیں کسی سبب کی ایک کڑی میں اختلاف نتیجہ کو مختلف کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جس کو ہم حادثہ کہتے ہیں اس کا بھی کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے جو وقتی طور پر ہمیں معلوم نہیں ہو رہا ہوتا۔ مشین ویسے ہی سبب و نتیجہ کی عملی شکل ہے۔

بیکن وہ پہلا شخص تھا جس نے کہا کہ ارسطو نے سائنس میں مقصد و غایت کو داخل کر کے

سائنس کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ سائنس میں غایت کو خارج کر دیا جائے کیونکہ فکر و تجسس کو علت غائی کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ فکر و تجسس کو اس بات کا پابند نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قیاس کے گھوڑے دوڑا کر یہ معلوم کرے کہ کسی چیز کے لیے پہلے سے طے شدہ کیا ہے؟ سائنس اور فکر کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مواد خالص مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہو۔ آخر کار مشینی مادیت نے ارسطو کے فکری نظام کو ملیا میٹ کر دیا۔ تاریخ انسانی کا یہ وہ انقلابی موڑ تھا جس پر حتمی مقاصد کی جگہ میکانکی علتوں نے لے لی۔ اب فکر کی دنیا غایت سے آزاد ہو کر سبب و نتیجہ کے میکانکی کڑی دار عمل میں داخل ہو گئی۔ اسباب و علل کے سلسلے کو ہی مشینی مادیت کہتے ہیں۔

قوانین فطرت

اٹھارہویں صدی آتے آتے دنیا بہت بدل چکی تھی۔ رہن سہن کے طریقوں، استعمال کی چیزوں، ذرائع آمدورفت اور پیداوار کے طریقوں کے لحاظ ہی سے نہیں بلکہ خیالات وافکار کے لحاظ سے بھی زمانہ بدل گیا ہوا تھا۔ دستکاری اور زراعت کا دور ختم ہو گیا تھا۔ مشینی اور صنعتی دور نے نہ صرف زندگی کو مادی سہولتوں سے آراستہ کر دیا تھا بلکہ اس کے سیاسی، معاشی اور فکری اثرات بھی مرتب ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مشین کی طرح کائنات بھی ایک ترتیب، تنظیم اور باقاعدگی کا نمونہ نظر آتی تھی اسباب ونتیجہ کی میکانیات ہی مادی دنیا میں حرکت وتبدیلی کا باعث سمجھی جانے لگی تھی۔ مادی کائنات کو ایک جامع نام یعنی فطرت کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

فطرت میں موجود باقاعدگی اور نظم کو قوانین کا نام دیا جانے لگا کہ فطرت اٹل قوانین کے تابع چل رہی ہے۔ ان قوانین کی دریافت ہی تسخیر کائنات ہے اور تسخیر کائنات ہی علم کو پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

یورپ کی فکری تاریخ میں اٹھارہویں صدی کے علم قوانین فطرت کے مرکزی خیال پر اپنی اپنی عمارت استوار کر رہے تھے۔ ان قوانین کی دریافت تجربہ ومشاہدہ کے ذریعے ممکن ہوئی۔ ان قوانین ہی کو قابل تصدیق حقیقت قرار دیا گیا۔ یہی قوانین اس قدر صحیح ثابت ہوئے کہ ان کے ذریعے سائنسی پیشگوئی کی صلاحیت پیدا ہوئی اور فکری مادیت نے اب سائنس یا تجربی مادیت کے روپ میں نیا جنم لیا یعنی مادیت کا فلسفہ اب سائنس کے روپ میں نیا جنم لے چکا تھا۔

ویسے تو جانور بھی تجربے سے سیکھتے ہیں مگر انسان سائنس کے سہارے فطرت پر کنٹرول حاصل کرنے لگا جب اس نے سیکھنے کے لیے خود تجربے کرنے شروع کر دیئے۔

پانی ڈھلوان کی طرف بہتا ہے۔ اس کا مشاہدہ اور اپنی طرف سے تجربہ کوئی بھی شخص، کسی وقت کسی بھی جگہ پر جو ڈھلوانی سطح کی ہو کر سکتا ہے۔ جب ایسے تجربوں سے ہمیشہ ہمیشہ ایک ہی نتیجہ برآمد ہو تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ پانی کا ڈھلوان کی طرف بہنا ایک قانون فطرت ہے۔ یہی تجربہ اگر پانی کے علاوہ تمام مائع چیزوں پر کریں اور نتیجہ وہی برآمد ہو جو پانی کے تجربے سے ہوا تو اس سے ایک عمومی قانون وضع کیا جاتا ہے کہ تمام مائع چیزیں ڈھلوان کی طرف بہتی ہیں۔ ایسا ہونے کے اسباب بھی سائنسدانوں نے دریافت کیے کہ کشش ثقل اور مائع اشیاء کے ایٹموں کا ایک دوسرے پر پھسلنا اس کے اسباب ہیں۔ یہاں تک یہ فلسفہ مادیت کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن اٹھارہویں صدی کی ریاضیاتی۔ میکانیات نے فلسفے کو سائنس میں اس طرح بدل دیا کہ نتیجہ پر اثر انداز ہونے والے الگ الگ اسباب کی ہندسی پیائش ہونے لگی۔ فطرت کا کوئی بھی وقوعہ یا مظہر متعدد اسباب کا پیدا کردہ ہو سکتا ہے۔ اور ہر سبب کی ریاضیاتی پیائش کے ذریعے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ اس کی سادہ سی مثال ہم سماوی میکانیات سے لیتے ہیں۔ اگر چاند پر صرف زمین ہی کی کشش اثر انداز ہو تو چاند کا ایک مدار بنتا ہے۔ اگر اس پر صرف سورج ہی کی کشش اثر انداز ہو تو اس کا ایک دوسرا مدار بنتا ہے۔ لیکن جب چاند کے اصل مدار کی پیائش کی گئی تو یہ ایک تیسرا مدار تھا جو زمین اور سورج کی مجموعی کشش کو ملا کر بنتا ہے۔ تینوں مداروں کی جیومیٹری ریاضیاتی تحلیل سے چاند پر زمین اور سورج کی کشش کا اپنا اپنا حصہ معلوم کر لیا گیا۔

اس طرح ریاضی نے موثر طور پر فلسفہ اور سائنس کی حد بندی کر دی۔ قوانین کی دریافت ایک ایسا مرحلہ تھا کہ آرشمیدس کے لیور کے قانون کی دریافت سے صدیوں پہلے ملاحوں کو چپو چلانا اور تاجروں کو ترازو سے تولنا آتا تھا مگر اس قانون کی مدد سے کئی ایسی ایجادیں کرنا ممکن ہو گیا جو محض عملی تجربہ رکھنے والوں کے گمان میں بھی نہیں تھیں۔

برقی مقناطیسی لہروں جن پر وائرلیس، موبائل، انٹرنیٹ اور سیٹلائیٹ کا انحصار ہے ان سے متعلقہ سائنسی علم کا آغاز فیراڈے نے کیا۔ اس نے پہلی مرتبہ برقی مظہر کے درمیانی واسطے کو تجرباتی تحقیق کا موضوع بنایا۔ فیراڈے کوئی ریاضی دان نہ تھا۔ لیکن اس کے حاصل کردہ نتائج کو میکسویل (Maxwel) نے ریاضیاتی صورت میں پیش کیا۔ اس نے فطری حساب کتاب سے اندازہ لگایا تھا کہ روشنی برقی مقناطیسی لہروں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد ہرز (Hertz) نے ایک

قدم آگے بڑھایا اور مصنوعی طور پر برقی مقناطیسی لہریں بنائیں۔ اب صرف ایسے آلات وضع کرنے رہ گئے تھے جن کی مدد سے ان لہروں کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا۔ اس کی ابتدا مارکونی نے ریڈیو کی ایجاد سے کی آج کی زندگی کے سارے آلات بتدریج ان لہروں پر منتقل کئے جا رہے ہیں۔

مادی خیالیت

مادیت اور خیالیت دو متضاد فکری نظام ہیں۔ لیکن شارحین نے مشینی مادیت کی ایسی تفسیر اور تعبیر کی کہ نہ صرف مادیت کو حقیقت تسلیم کرلیا بلکہ اسے خیالیت کے تابع کردیا۔ جس سے ایک جدید قسم کی خیالیت نے جنم لیا۔ یہ ایک طرح کی دوئیت (Dualism) تھی ۔ اس کی بنیادیں تو مادیت پر استوار کی گئیں مگر تابع یہ خیالیت کے تھی یہ اس وقت کے عبوری دور کی لازمی ضرورت تھی۔ جس سے ایک طرف مذہبی پیشواؤں میں مادیت کے بارے میں نرم گوشہ پیدا ہوا تو دوسری طرف سے مادئین کے لیے مادی دنیا میں دخل نہ دینے والی تھوڑی سی خیالیت اور ماورائیت بھی قابل قبول بن گئی۔

مادیت کے فکری نظام کی ابتداء اس سادہ سے آسانی سے سمجھ میں آجانے والے سوال سے ہوئی تھی کہ مادہ مسلسل حرکت میں اور ارتقا پذیر کیوں ہے۔ جس کے جواب میں مادئین کا خیال تھا کہ مادے میں حرکت و تبدیلی مادے کی ساخت میں موجود خود کار نظام کی وجہ سے ہوتی ہے مادئین کا دعویٰ تھا کہ مادے میں تبدیلی یا ارتقا کسی بیرونی خیال یا عامل کی وجہ سے نہیں۔ اب تک مادہ کا تصور کسی جامد شے کا نہیں رہا تھا بلکہ مادہ اب داخلی تغیرات کے ایک سلسلے کا نام تھا۔ مادے کی ساخت کو معلوم کرنا، مادے کی ساخت میں موجود سلسلہ تغیرات کی کھوج لگانا اور یہ معلوم کرنا کہ کیا یہ تغیرات حادثاتی طور پر رونما ہوتے ہیں یا کسی اصول، ضابطہ اور قانون کے مطابق ہے اس کھوج کا نام تسخیر مادہ ہے۔ اس کے لیے تجربی اسلوب اختیار کیا جاتا ہے جس کی تصدیق کوئی بھی انسان، کسی بھی وقت کسی بھی جگہ پر کرسکتا ہے اور حاصل شدہ نتائج کو سائنس کہا جاتا ہے۔

خیالیت اس کے برعکس اس سادہ اور عام فہم سوال کے اس جواب سے شروع ہوئی تھی کہ

مادہ جامد، ٹھوس، بے جان مردہ شے ہے یہ خود تغیر پذیر یا متحرک نہیں ہوسکتا جب تک کوئی بیرونی عامل اسے حرکت نہ دے۔ یہ کوئی مادی قسم کا بیرونی عامل نہیں ہے بلکہ تخیل، احساس یا جذبے جیسا کوئی بیرونی عامل ہے۔ غیر مادی بیرونی عامل ہماری عقل، سمجھ، فہم وادراک سے ماورا ہے۔ حقیقت مادی دنیا سے الگ ہے ماورا ہے۔ اہم ترین صداقتیں بھی عقل اور مشاہدے کی رسائی میں نہیں ہیں۔ انہیں کوئی کامل ہستی پا سکتی ہے۔ ہمیں کسی کامل ہستی کو علم کی اتھارٹی مانتے ہوئے اس کے حقیقتوں تک رسائی کے دعویٰ پر کامل یقین رکھنا لازمی ہے۔ مادی کائنات سے ماوراء کے متعلق ہر قسم کی قیاس آرائی کا نام مابعد الطبیعات ہے۔

جب یہ دونوں فکری نظام اتنے متضاد ہیں کہ ایک مادے کو حقیقی سمجھتا ہے تو دوسرا تخیل کو۔ ایک کا علم حاصل کرنے کا ڈھنگ تجربی ومشاہداتی ہے تو دوسرے کا قیاسی واستدلالی۔ تو سوال یہ ہے۔ کہ پھر کیسے مشینی مادیت کے شارحین نے ان دونوں کو ملا دیا؟

طبقاتی معاشروں میں لوگوں کی بہت بڑی اکثریت پر ہمیشہ ایک چھوٹی سی اقلیت قانون نافذ کرتی ہے بلکہ بادشاہت کے دور میں تو صرف بادشاہ کا حکم ہی قانون ہوا کرتا تھا۔ مشینی مادیت کے نظریہ کی پیدائش کے زمانے میں دنیا بھر ہی میں بادشاہی نظام رائج تھا اور دنیا بھر ہی میں بادشاہ کی زبان سے نکلا ہوا لفظ قانون تھا۔ جس کی وجہ سے یہ تاثر عام تھا کہ قوانین ہمیشہ اوپر سے نافذ ہوتے ہیں۔ اب تک سائنس نے جو ترقی کی تھی اور تسخیر مادہ کے عمل میں جو ضابطے اور قوانین دریافت کیے تھے انہیں قوانین فطرت کا نام دیا گیا تھا۔ والٹیئر اور تھامس پیشن جیسے کچھ میکانکی (مشینی) فلسفیوں نے کہا کہ اگرچہ ساری کائنات، مادی دنیا اور فطرت لگے بندھے قوانین کے تابع چل رہی ہے مگر یہ قوانین فطرت مادی دنیا پر کہیں باہر سے لاگو ہوئے ہیں۔ کسی خارجی ہستی نے لاگو کیے ہیں۔ جو ایک بار ان قوانین کو مادی دنیا پر لاگو کرنے کے بعد خود بھی ان قوانین کو کہیں ایک جگہ بھی ٹوٹنے نہیں دیتی۔ قوانین فطرت کا غیر متبدل اور اٹل ہونا ہی ایسی خارجی ہستی کی عظمت و بڑائی اور عادل ہونے کی علامت ہے۔

قوانین فطرت کو سماجی قوانین کے مماثل قرار دے کر یہ سوال ابھارے گئے کہ قوانین فطرت کس نے بنائے اور مادے پر لاگو کیے؟ جس کے جواب میں مادیت کے فلسفے میں مادے میں قانون نافذ کرنے والی ماورائی ہستی بطور بیرونی عامل کا تصور داخل کیا گیا۔ اس طرح مشینی

مادیت کے شارحین نے مادی خیالیت کی راہ ہموار کی۔

قدیم مذاہب میں خدا کا تصور ساسانی بادشاہوں کے دربار کے نقشے کے عکس کے طور پر لیا گیا تھا بادشاہ جس کو چاہتا عزت دیتا اور جس کو چاہتا بے عزت کر دیتا۔ اگر کوئی تخت پر بیٹھے ہوئے بادشاہ کے سامنے سر بسجود ہوتا زمین سجدہ کو بوسہ دیتا۔ بادشاہ کی منشاء اس کو قبول کرنے کی نہ ہوتی تو بادشاہ اسے قتل کرنے کا حکم دے دیتا۔ کوئی بادشاہ کو گالیاں نکالتا ہوا داخل ہوتا بادشاہ اپنی منشاء کے مطابق اس کی طرف اشرفیوں کا تھیلہ اچھال دیتا۔ بادشاہ کے مقربین درباری بادشاہ کے دونوں طرح کے رویے پر داد تحسین پیش کرتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کائنات کے بارے میں انسان کا تصور یہ تھا کہ زمین فرش ہے اور آسمان چھت ہے یا پھر سات زمینوں اور سات آسمانوں کا تصور آ گیا۔ زمین پر نوشیرواں کی بادشاہت آسمان پر خدا کی۔ کرسچین عبادت بھی یہ ہے کہ اے خداوند جس طرح تیری مرضی آسمانوں پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو یہ وہ وقت تھا جب آسمان کے بادشاہ کا تصور زمینی بادشاہ کے دربار کے عکس کے طور پر کھینچا گیا تھا خدا کا ایسا تصور (Theism) کہلاتا ہے۔ ہزاروں سال بعد جب انسان کو کائنات کی وسعتوں کا علم ہوا کہ اس کی تو سرحد ہی کوئی نہیں یہ تو بے انتہا ہے۔ ان گنت کہکشاؤں، شمسی نظاموں اور جھرمٹوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں ہماری زمین کی حیثیت سمندر کے کنارے پڑی ہوئی ریت کے زروں میں سے ایک ذرے کے برابر ہے۔ کچھ ستارے تو ایسے ہیں کہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکینڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہوئی ان کی روشنی ہزاروں سال بعد زمین پر پہنچتی ہے اور ان کے درمیان ربط و ترتیب ایسی کہ اٹل قوانین کے تابع چل رہی ہے کائنات کہ کسی ذرے میں بال برابر انحراف نہیں پاتے۔ آپ آنے والے ہزاروں سال کا سورج کے طلوع وغروب کا کیلنڈر بنا سکتے ہیں اس طرح کی مادی کائنات سے ایک نئے علم الٰہیات نے فرانس میں جنم لیا جسے (Deism) کہتے ہیں۔

اس تصور کے مطابق خدا نے مادی کائنات میں قوانین مقرر کر کے اسے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ مادی کائنات کی ہر چیز باقاعدگی، نظم اور ترتیب کے ساتھ ان قوانین کے تابع چلتی چلی جا رہی ہے۔ یہ ایک خودکار مشین ہے۔ اس میں موجود قوانین از خود نتیجہ پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔

نہ صرف یہ کہ یہ قوانین مادی کائنات پر لاگو ہیں معاشرہ بھی انہی قوانین کے تابع ہے، خوشحالی کے قوانین الگ، پسماندگی کے قوانین الگ۔ جو قوم خوشحالی کے قوانین پر عمل کرے گی

خوشحالی ان کا مقدر ہوگی اور جو قوم خوشحالی کے قوانین سے روگردانی کرے گی بدحالی اس کے حصے میں آئے گی قوانین کا نتیجہ ہی تقدیر ہے۔ ایک بار ان قوانین کو لاگو کر کے خود خدا بھی ان میں مداخلت نہیں کرتا۔ میکانکی فلسفیوں کے مطابق جہاں مادی کائنات اور معاشرہ ان فطری قوانین کا پابند ہیں وہاں ایک شخص کی انفرادی زندگی پر بھی انہی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسے قانون مکافات عمل کہا جاتا ہے۔ ایک شخص جیسا کرے گا اس کا نتیجہ ہیں تھوڑے عرصے میں بھگت لے گا اگر چہ یہ قانون نہیں تھا بس لوگوں کا قیاس تھا۔

ڈیکارٹ کے پیروکار ڈاکٹر لامتری نے مشینی مادیت کا اطلاق بائبل مقدس پر کیا اور کہا کہ چونکہ بائبل مقدس خدا کا کلام (word of God) ہے اور مادی کائنات (work of God) ہے ان دونوں میں تضاد نہیں ہوسکتا سائنس چونکہ ان قوانین کی دریافت کا نام ہے جو خدا نے اس مادی کائنات میں مقرر کیے ہیں اور بائبل وہ الفاظ ہیں جو خدا نے ہمارے لیے اتارے ہیں۔ اس لیے جہاں کہیں عیسایت اور سائنس میں تضاد نظر آئے۔ اس تضاد کو سائنس کی روشنی میں حل کیا جانا چاہیے۔ لامتری نے کہا کہ قوانین فطرت اٹل ہیں اور معجزات وہ من گھڑت اور فرضی کہانیاں ہیں جو مذہب کو کاروبار بنانے والے لوگوں نے اپنی دکانداری کے لیے اور قوانین فطرت کو غلط ثابت کرنے کے لیے اپنی طرف سے بنائی ہیں۔

ہندوستان میں سرسید احمد خاں نے قرآن کریم کی تفسیر میکانکی مادیت کے زاویہ نظر سے کی۔ انہوں نے قرآنی آیات سے ثابت کیا کہ قوانین فطرت غیر متبدل اور اٹل ہیں جو فاطر السموات والارض نے اس مادی دنیا پر لاگو کیے ہیں۔ خدا خود بھی ان میں تبدیلی نہیں کرتا۔ ان خیالات رکھنے کی بنیاد پر انہیں نیچری اور کافر قرار دے دیا گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ متشابہات کو محکمات کی روشنی میں حل کرنا چاہیے۔ سرسید احمد خان کے کام کو زیادہ موثر، مدلل اور منظم انداز میں علامہ غلام احمد پرویز نے آگے بڑھایا، انہوں نے جدید سائنسی، معاشی اور معاشرتی علوم سے استفادہ کیا اور میکانکی مادیت کے استعمال سے قرآن کریم کا ایک مربوط فکری نظام پیدا کیا۔

سائنسدانوں نے مشینی مادئین کے دلائل کو مسترد کر دیا۔ ان کا کہنا تھا میکانکی مادئین نے بڑی ہوشیاری سے مادے اور قوانین فطرت کو دو الگ وجود رکھنے والی چیزیں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ قوانین فطرت کو مادے سے الگ سمجھنے کی وجہ سے یہ تصور قائم کیا گیا ہے کہ یہ قوانین

مادے میں کہیں باہر سے نافذ ہوتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے یہ قوانین فطرت دراصل مادے کی خصوصیات (properties of matter) ہیں جنہیں مادے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ پانی جب تک پانی ہے تب تک وہ مائع کی خصوصیات کا حامل ہوگا جب پانی برف بن جائے تو وہ ٹھوس مادے کی خصوصیات اپنا لے گا۔

لکڑی پانی پر تیرتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لکڑی جن ذرات سے مل کر بنی ہے ان کا درمیانی فاصلہ پانی کے ذرات کے درمیانی فاصلے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہ تیرتی ہے۔ لوہا پانی میں ڈوب جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لوہے کے ذرات کا درمیانی فاصلہ پانی کے ذرات کے درمیانی فاصلے کے مقابلے میں انتہائی کم ہے۔ اب اگر لوہے کے ذرات کا درمیانی فاصلہ اتنا بڑھا دیا جائے کہ ان کا درمیانی فاصلہ پانی کے ذرات کے درمیانی فاصلے سے بہت زیادہ ہو جائے تو لوہا بھی پانی پر تیرے گا۔ اس طرح کے لوہے کو پانی پر تیرانے کے لیے کسی بیرونی عامل کی ضرورت نہیں وہ ازخود اپنے ایٹموں کے اندرونی فاصلے کے زیادہ ہونے کی وجہ جو خصوصیات اپنی ساخت کی وجہ سے اپنائے گا وہ اس کے تیرنے کا سبب ہوگا۔

میکانکی مادئین کی تاویلات جس پر سائنس دانوں نے اعتراض کیا۔

(۱) مشین ہمیشہ ایک ہی عمل کو بار بار دہرائے چلی جاتی ہے جس سے مادی کائنات کا ایک جمودی تصور ابھرتا ہے۔ اس کے برعکس انسان کا ہزاروں سال کا مشاہدہ ہے کہ مادی کائنات کی ہر چیز ہر لمحے تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہے یا ارتقا پذیر ہے معاشرہ بھی مسلسل ارتقا پذیر ہے۔ کائنات کو مشین تصور کرنے والے کائنات کو جامد ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

(۲) مشین کو حرکت میں لانے کے لیے بیرونی عامل اور بیرونی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ مادے کے اندر متضاد قوتوں کی کارفرمائی اور ان کی باہمی آویزش کے نتیجے میں حرکت اور پھر اس حرکت کے نتیجے میں توانائی کا پیدا ہونا دریافت ہو چکا ہے۔

(۳) مشین کسی خاص مقصد کے لیے بنائی جاتی ہے جس سے ہر فلسفی نے اپنا اپنا الگ نتیجہ اخذ کیا کہ کائنات اس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے۔ مذہبی لوگوں نے اپنے قیاس کے مطابق نتائج اخذ کیے کہ کائنات کا مقصد ان کے مطابق یہ ہے۔ جبکہ کسی کے بیان کئے گئے مقصد کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں۔ سائنس اس کائنات کو مادی پریسوں (Proceses) کا مجموعہ سمجھتی ہے مادی

مظاہر کی توجیہہ مادی مظاہر میں تلاش کرتی ہے۔

(۴) مشین چھوٹے بڑے بہت سے پرزوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ الگ الگ پرزوں کی حرکت مل کر مشین کو چلانے کا باعث بنتی ہے۔ پرزوں میں چھوٹے بڑے کا سوال نہیں۔ سسٹم کو چلانے کے لیے ہر پرزے کا وجود لازمی ہے۔ ان میں سے کوئی ایک پرزہ نہ ہو تو سسٹم بے کار ہوجائے۔ اس سے سماجی میکانکی مادئین نے یہ نتیجہ نکالا کہ معاشرہ بھی چونکہ مادی وجود رکھتا ہے اور کائنات کی طرح یہ بھی ایک مشین کی طرح کام کرتا ہے۔ طبقے اور طبقوں کی مختلف پرتیں اس مشین کے پرزے ہیں۔ ان طبقوں اور ان کی ذیلی پرتوں کی وجہ سے معاشرے کی حرکت قائم ہے۔ جو طبقے زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہیں ان کا محروم رہنا اور معاشرے کے وجود کا حصہ ہونا اتنا ہی لازمی ہے جتنا ان طبقات کو محروم اور بدحال رکھنے والے استحصالی طبقے کا۔ اس دلیل پر یا اس تاویل پر طبقات کے وجود کو معاشی نظام کا نتیجہ سمجھ کر، معاشی انصاف پر مبنی معاشرے کے قیام کی جدو جہد کرنے والوں کے خلاف مشینی مادئین کی یہ دلیل سرمایہ داری نظام کے دانشوروں کا سوشلسٹ معاشرے کے خلاف نظریاتی ہتھیار ثابت ہوئی جس کے ذریعے وہ طبقاتی جدوجہد کو روک سکتے تھے۔

"میکانکی مادیت کے نزدیک انسان ماحول کی پیداوار ہے۔ یہ نظریہ اس بات کو نہیں مانتا کہ معاشرتی نظام بدل سکتا ہے اور اس کی جگہ بہتر معاشرتی نظام لے سکتا ہے۔ یہ نظریہ شعور کو محض ماحول کا ردعمل سمجھتا ہے اور اسے انسانی سرگرمی کے نتیجے کی حیثیت سے نہیں دیکھتا حالانکہ انسان نے تمام دنیاوی علم محض دنیا پر فکر کرنے سے نہیں بلکہ مادی کائنات پر عمل کرنے اور دنیا کو بدلنے کے پروسیس کے دوران حاصل کیا۔"

(سائنسی فکر اور ہمعصر زندگی۔ ثاقب رزمی)

میکانکی فلسفیوں نے اس وقت تک کے معلوم سائنسی حقائق سے جو نتائج اخذ کیے ان سے یہ تاثر ابھرا کہ مادہ بے جان۔ جامد و ساکت چیز ہے۔ جس کو حرکت دینے کے لیے بیرونی ایجنسی نے قانون لاگو کر کے حرکت دے رکھی ہے۔ یہ مادے کا جمودی تصور تھا جس کے نتیجے میں ضرب المثل بنی کہ فطرت کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ تاریخ کے بارے میں اسی دور میں یہ تصور قائم کیا گیا کہ چونکہ مادی کائنات اور معاشرہ مشین کی طرح ایک ہی عمل کو بار بار دہرائے چلے جاتے ہیں اس طرح

تاریخ بھی اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا تھا کہ سائنس کی محدودیت کی وجہ سے ایسے نتائج اخذ کیے گئے تھے۔

سائنس کی محدودیت کیا ہے؟ اسے ہم وضاحت سے سمجھتے ہیں۔ جب انسان کے پاس دیکھنے کے لیے صرف آنکھ ہی تھی تب انسان کا کائنات کے بارے میں یہ نظریہ تھا کہ زمین فرش ہے اور آسمان چھت۔ کچھ عرصے کی سوچ بچار کے بعد مندروں معبدوں کے میناروں پر مشاہدہ ستاروں کا مطالعہ کرنے کے بعد سات زمینوں اور سات آسمانوں پر مشتمل کاسمولوجی کا تصور قائم ہوا۔ کچھ صدیاں گزری تو دوربین ایجاد ہوگئی۔ پھر ستارے قریب نظر آنے لگ گئے دوربین نے کائنات کے بارے میں صدیوں سے قائم تصورات بدل دیئے۔ نہ زمین کائنات کا مرکز رہی نہ آسمان نام کی کوئی چیز۔ زمین کے کائنات کے مرکز ہونے کی وجہ سے زندگی، انسان کا کائنات میں مقام، مقدس ہستیوں کی کارفرمائی، انسان کے اس دنیا میں لانے کے مقاصد، آخرت اور دوبارہ زندگی کے جتنے بھی مقاصد اور تصورات قائم کیے گئے تھے وہ زمین کے سمندر کے کنارے پڑی ریت کے زرّوں میں سے ایک بے وقعت ذرے کے حقائق نے متزلزل کردیئے۔

دوربین ایجاد کر کے انسان نے اپنی آنکھ سے دیکھنے کی طاقت کو ہزاروں گنا بڑھالیا تھا کہ اب وہ لاکھوں میل دور تک دیکھ سکتا تھا۔

1990 میں ہبل نامی دوربین جو خلا میں چھوڑی گئی تھی وہ زمین پر موجود اسٹیشن کو ایسے ایسے ستاروں اور سیاروں کو معلومات فراہم کرتی رہتی ہے جن کی روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکینڈ کی رفتار سے سفر طے کرتی ہوئی ہم تک سینکڑوں سال بعد پہنچتی ہے جیسے جیسے انسان کا علم بڑھتا جارہا ہے اس کی معلومات حاصل کرنے کی محدودیت اب وسعت میں تبدیل ہورہی ہے۔

خوردبین کی ایجاد سے پہلے انسان جن بیماریوں کو دیوتاؤں کا انسانی جسم میں حلول کرجانا سمجھتا تھا انہیں خوردبین نے جراثیم کی شکل میں انسان کے سامنے بے نقاب کردیا۔ الیکٹرانک مائیکروسکوپ کی ایجاد نے تو تصورات کی دنیا ہی بدل دی۔ اب آپ آنکھ سے نظر نہ آنے والی کسی بھی چھوٹی سی چھوٹی چیز کو لاکھوں گنا بڑا کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ جسم کے خلیات کو بھی۔

سائنسی حقائق ایسا نہیں ہے کہ سارے کے سارے ایک ہی بار انسان پر منکشف ہوجائیں جوں جوں انسانی علم کی سطح بلندتر ہوتی چلی جاتی ہے اور انسان ایسے مشاہدے کو وسعت دینے کے

لیے آلات وفنی مہارتوں میں اضافہ کرتا رہا ہے۔ مادی کائنات کے متعلق انسانی عقل پر پڑے جہالت کے پردے اٹھتے چلے جارہے ہیں۔ انسان کا تسخیرِ مادہ اور تسخیرِ کائنات کے علم میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ انسان حقیقتوں کے قریب سے قریب تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ ہر زمانہ اپنے اندر سائنس کی ایک محدودیت رکھتا ہے اس محدودیت کے ساتھ ساتھ آگے کا سفر بھی جاری ہے۔

مادی فلسفوں کے نزدیک یہ بات قابل قبول نہیں تھی کہ وقتی لاعلمی کے باعث ایک پورا الہیاتی نظام کھڑا کردیا جائے جس طرح میکانکی فلسفیوں نے کیا۔ کیونکہ اس وقت تک سائنس دان مادے کی ساخت میں موجود حرکت وتبدیلی کا خودکار نظام تلاش نہیں کر پائے تھے اس لیے اس وقت تک کی سائنس کی بنیاد پر قائم کیے گئے مادی فلسفے نے خودکاریت کو بیرونی عامل کو سونپ دیا کہ اس نے خودکار مشین بنا کر چھوڑ دی ہے۔

اب تک ارسطو کی ذہنی غلامی سے سائنس خود کو آزاد کر چکی تھی۔ جدید سائنس کا آغاز ہونے والا تھا۔ جس نے مشینی مادیت پر کاری ضرب لگائی۔ وہ تھا مادے کی ساخت میں موجود مخالف قوتوں کا جدل جو مادے میں خودکاریت کا سبب ہے۔

خالص سائنس کا نظریہ

مادیت کے فکری نظام پر پہلا حملہ مشینی مادیت نے کیا۔ یہ شعوری حملہ نہیں تھا۔ دوسرا حملہ جو مادیت کے فکری نظام پر کیا گیا وہ خالص سائنس کی تحریک تھی یہ شعوری حملہ تھا۔

یورپ میں بادشاہت زراعت کے معاشی نظام کے بالائی سیاسی ڈھانچے کے طور پر قائم تھی۔ یونانی فلسفے کی متابعت میں عیسائیت کے عقیدوں کی تفسیر کی جاتی تھی۔ اس تفسیر کے ذریعے عیسائیت کو بادشاہت کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیا گیا تھا۔ یہی ان کا فکری نظام تھا۔ ریاست کی طاقت سے عام لوگوں کو مسلسل خوف میں رکھا جاتا۔ مذہبی پیشوا انہیں بادشاہ کی بلاچوں وچرا اطاعت کے بدلے ابدی خوشی کی نوید سناتے جو انہیں اگلی زندگی میں حاصل ہونے والی تھی۔

دوسری طرف سائنس کے نت نئے انکشافات صدیوں پرانے فکری نظام پر مسلسل حملہ آور ہو رہے تھے تجربی سائنس تنقیدی بھی اور تخریبی بھی۔ دونوں طرح سے پرانے فکری نظام کو ختم کر کے ہی اپنے لیے جگہ بنا رہی تھی۔ صنعتی انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ نئے طبقے وجود میں آگئے تھے۔ نئے طبقات کا وجود سماجی تبدیلی کے نئے فکری نظام کو آگے بڑھانے سے مشروط تھا۔

عقیدوں کی بنیاد پر تعمیر ہو چکے پرانے فکری نظام اور سائنس کے انکشافات کی بنیاد پر تعمیر ہو رہے نئے فکری نظام کے درمیان مسلسل ٹکراؤ، تصادم اور جدل جاری تھا۔ پرانے فکری نظام کی پشت پر جاگیردار، مذہبی پیشوا، بادشاہ کے خزانے اور اس کی فوج تھی۔ جبکہ نئے فکری نظام کی پشت پر صنفی انقلاب کے نتیجے میں پیدا ہونے والے طبقے اور مادی حالات تھے۔

فکری جدل پرانے فکری نظام کو اکھاڑتا بچھاڑتا لازمی طور پر نئے فکری نظام کی مکمل کامیابی تک جاری رہنے والا تھا۔ درمیان میں ایسی فکری لہریں اٹھیں جو بظاہر تو الگ وجود رکھتی تھیں مگر در

پر وہ اپنی اپنی بساط کے مطابق وہ پرانے فرسودہ فکری نظام یا جدید سائنسی نظام کی حمایت میں اٹھی تھیں۔ان میں سے ایک تحریک ''خالص سائنس'' کے تصور سے شروع کی گئی۔اس تحریک کو شروع کرنے والے افادیت پسند کہلاتے تھے۔

ان کا سارا زور اس بات پر تھا کہ سائنس کو ایجادات تک محدود کیا جائے اور ان ایجادات کے ذریعے انسانی زندگی میں صرف مادی سہولتیں مہیا کی جائیں۔ جو مصنوعات بنانے والے اور صارفین دونوں کے لیے منافع بخش ہوں۔ان سہولتوں کو ٹرانسپورٹ۔گھریلو استعمال کی مشینری، موبائل انفارمیشن ٹیکنالوجی، صحت و زندگی، میڈیکل ٹیکنالوجی کی سہولیات، زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے مشینری تک محدود رکھا جائے۔جو سرمایہ داروں کے لیے ساری دنیا سے روپیہ اکٹھا کرنے کا باعث بنے۔

خالص سائنس کا مقصد یہ تھا کہ سائنس کے انکشافات کو سماجی مضمرات سے الگ کر دیا جائے۔سائنس کے ثابت شدہ حقائق کو انسانی سوچ اور فکری نظام پر اثر انداز ہونے سے روکا جائے۔ بیالوجی کی دریافتیں اور علم الارضیات کی شہادتیں خواہ یہ ثابت کر دیں کہ ہر قسم کی حیات ارضی ایک ہی کیمیائی مادے سے پیدا ہوتی ہے اور اس اعتبار سے سب انسان برابر ہیں لیکن طبقاتی معاشروں کے استحصالی طبقوں نے شعوری بندوبست کیا کہ ایسی فکر مقدس ہستیوں کے تصور کو متاثر نہ کرے۔ذات پات کے نظام کو قائم رکھ کر فائدہ اٹھانے والی ذاتوں کو نقصان نہ پہنچائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ معاشی ناانصافی کی بنیادوں پر ضرب نہ لگائے۔

سائنسی افکار اور سائنسدان صرف لیبارٹریوں تک محدود ہوں۔سرمایہ دار طبقہ طبی سائنس کی ایجادات اور مصنوعات سے منافع تو کمانا چاہتا تھا مگر معاشرتی نظام میں سائنسی فکر کے داخل ہونے سے خوفزدہ تھا کہ اسے ڈر تھا کہ اس طرح استحصال کی بنیاد پر قائم معاشرے کی بنیادیں ہل جائیں گی'' خالص سائنس'' کے نام کی اس طرح کی بانجھ سائنس مذہبی پیشوائیت اور بادشاہت کے لیے قابل قبول تھی۔اس کے بعد انگلستان اور فرانسیسی یونیورسٹی کی طرف سے سائنس کی مخالفت دو صدیاں جاری رہنے کے بعد ختم ہوگئی تھی اور یونیورسٹیوں میں سائنس کو بطور شعبہ علم تسلیم کر لیا گیا تھا۔

یورپ کے کچھ بادشاہوں کو ایسی'' خالص سائنس'' بے ضرر معلوم ہوتی تھی جس کو اس کے

سماجی مضمرات سے الگ کر دیا گیا ہو۔ایسی سائنس جو معاشرے میں ایسی فکری تبدیلی نہ لائے جو حکمرانوں کے لیے خطرہ بن جائے ایسی سائنس کی سرپرستی کرنے میں حکمران طبقوں اور بادشاہ کو کوئی عار نہیں تھا۔ابتدائی صدیوں میں تو سائنس میں کوئی حد بندی نہیں تھی لیکن سائنسی تحقیق میں اب اتنی وسعت پیدا ہوگئی تھی کہ ہر دائرہ تحقیق نے فزکس، کیمسٹری، بیالوجی اور ریاضی کے نام سے جداگانہ شناخت بنالی ہوئی تھی۔ہندوستان میں برطانوی قبضے کے دوران ایسٹ انڈیا تجارتی کمپنی نے جو نظام تعلیم رائج کیا تھا'' خالص سائنس'' اس تعلیم کے مقاصد کا لازمی عنصر تھی۔کیونکہ برطانوی آقا اپنی رعایا کو ہر اس نظام فکر سے دور رکھنا چاہتے تھے جو غلام کو معاشی طور پر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی ترغیب دے اور غاصبوں کے خلاف بغاوت پر مائل کرے۔

پاکستان کے حکمران طبقے نے تو روز اول سے بانجھ'' خالص سائنس'' کو بنیاد پرستی کے تابع کر دیا جس سے سائنس نہ تو ہمارے پیداواری نظام کو بہتر کر سکی نہ ہی مذہبی بنیاد پرستی کا فکری طور پر مقابلہ کر سکی۔یہاں تک کہ پاکستان کے معمار اول سمجھے جانے والے سرسید احمد خان کی روشن خیال تحریروں کو نصاب میں کوئی جگہ نہ ملی۔

خالص سائنس کے نظریے کی برکت سے آج سارے پاکستان میں سائنس خشک اور بور کرنے والے مضمون کے طور پر پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔سائنس کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ سائنس صرف کیمسٹری کے فارمولے، الجبرے کی مساواتیں، فزکس کے قوانین اور لیبارٹری کے اندر کیے جانے والے تجربات کا نام ہے۔اس لیے ہم سائنس کو حفظ کرتے ہیں۔پرائیویٹ تعلیمی ادارے حافظ سائنس بنا کر زیادہ نمبر لینے کے کاروبار میں اربوں روپے کما رہے ہیں۔ سائنس کے فکری نظام کو حکمران طبقات نے سائنس سے اس طرح الگ کر دیا ہے جس طرح کسی پھل دار درخت کی تمام شاخیں کاٹ دی جائیں اس کا تنا باقی رہ جائے اور ہم تنے سے پھل حاصل کرنے کی امید لگا کر فصل گل کے منتظر ہوں۔مستزاد یہ کہ 1978ء کی تعلیمی پالیسی کے بعد سائنس میں بھی دینیات پڑھائی جارہی ہے۔

ہماری روزمرہ زندگی میں'' خالص سائنس'' کا مطلب یہ ہے کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی فراہم کردہ مادی سہولتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاؤ مگر جدید خیالات کو قریب نہ آنے دو۔سادگی کا درس دینے والے تمام فرقوں کے علمائے کرام، ترک دنیا کا عملی نمونہ پیش کرنے والے تصوف کے

تمام سلسلوں کے بانیوں کے آج کے پیروکار، مذہبی پیشوااور مقدس ہستیاں، خلافت راشدہ کے دور کو واپس لانے کی خواہش رکھنے والے جدید یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل دانش ور اور ہر وقت اٹھتے بیٹھتے آخرت کی فکر اور ایمان کی سلامتی کا نمائشی ورد کرنے والے مڈل کلاس کے لوگ آج تک کی سائنس کی فراہم کردہ مادی سہولیات جیسے ایئر کنڈیشنڈ، لینڈ کروزر گاڑیاں موبائل، انٹرنیٹ، ٹیلیویژن کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں لیکن سائنس کے فکری نظام پر ہر وقت حملے کی تیاری میں رہنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ جسم کو اکیسویں صدی کی سہولتوں میں زندہ رکھنا چاہتے ہیں مگر سوچ کو گیارہویں صدی میں قید رکھنا چاہتے ہیں۔ جگر کی پیوندکاری اور دل کے بائی پاس آپریشن کا عملی فائدہ اٹھانے کے بعد بھی کہتے ہیں کہ موت کا وقت مقرر ہے۔ اب تو بنیاد پرستی کو مضبوط کرنے کے لیے بھی جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کے آلات کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ خالص سائنس کے تصور سے حکمران طبقے نے قدامت پسندی پر ضرب لگانے والے سائنس کے فکری نظام کو کامیابی سے آگے بڑھنے سے روک لیا۔

یورپ کے نامور فلسفی ہنری برگسان اور ولیم جیمز جیسے لوگ بھی سائنس کو اس کے انقلابی عنصر سے محروم کرنے کے درپے تھے۔ انہوں نے اس تصور کو مسترد کر دیا کہ انسان کے مقدر میں کسی نمایاں بہتری کے لیے سائنس کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ دونوں فلسفی الگ الگ فکری طریقوں سے صرف ایک ہی مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے کہ سائنس دان صرف سائنس پر توجہ دیں اور سماجی ذمہ داری سے گریز کریں۔ ایک طرف وہ سائنس کو منظم مذہب اور ریاست کے حکمران طبقوں کے لیے قابل قبول بنانا چاہتے تھے دوسری طرف سائنس کو سرمایہ داری نظام میں مصنوعات سے منافع کما کر سرمایہ داروں کے لیے منافع کمانے کا ذریعہ تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ اس طرح ان کے خیال میں اس طرح سائنس معاشی انصاف اور سماجی برابری کا نظریہ پیدا کر کے سرمایہ دارانہ معاشرتی نظام کو نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ ولیم جیمز نے اپنی فکر کو نتائجیت پسندی کا نام دیا۔

انیسویں صدی کی پیش رفت

19 ویں صدی کے آغاز ہی میں سائنس مشینی مادیت کے دور کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل رہی تھی۔ نئی دریافتیں، نئی ایجادات، نئے تجربے سائنس کے علم کو آگے بڑھا رہے تھے۔ جس کے نتیجے میں سائنس نے 19 ویں صدی میں دو بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ جن کی بنیاد پر 20 ویں صدی سماجی انقلابات کی صدی بن گئی۔

1۔ سائنس جو ابھی تک فلسفہ مادیت کے اس دعویٰ کی تصدیق نہیں کر پائی تھی کہ مادے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ایک خودکار نظام مادے کی ساخت ہی میں موجود ہے۔ اس خودکار نظام کو چلانے والی توانائی بھی مادے میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ انیسویں صدی میں ممکن ہوا کہ ایٹم کی اندرونی ساخت کو جاننے کی راہیں ہموار ہوئیں اور ایٹم میں موجود وہ خودکار نظام دریافت ہو گیا جو مادی کائنات میں حرکت و تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔ مادے ہی کے توانائی میں تبدیل ہو جانے اور توانائی کے واپس مادے کی شکل میں تبدیل ہونے کے دوطرفہ عمل کا انکشاف ہوا۔

2۔ طبیعی سائنسوں کا ارتقاء بڑی تیزی کے ساتھ اس لیے ہوا کہ ان سے استحصالی طبقوں کے مالی مفادات وابستہ تھے۔ اس کے برعکس ان طبقوں نے معاشرتی سائنسوں کو خاص طور پر سیاسیات معاشیات اور عمرانیات کو سائنسی بنیادوں پر اس لیے ابھرنے نہیں دیا کیونکہ اس سے ان کے استحصالی نظام پر ضرب لگتی تھی اس مقصد کے حصول کے لیے حکمران طبقے نے خالص سائنس جیسی تحریکوں کی سرپرستی کی تو دوسری طرف معاشرے کی بدلتی ہوئی ضرورتیں اس بات کا تقاضا کر رہی تھیں کہ سائنس سے نہ صرف مادی فائدے اٹھائے جائیں بلکہ معاشرتی مسائل کے حل کے لیے بھی سائنسی اسلوب اپنایا جائے۔ اس معاشرتی شدت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں

کہ خود کو مسیح موعود سمجھنے والے سینٹ سائمن جیسے لوگ بھی سائنس ہی کو سماجی مشکلات کا حل بھی سمجھتے تھے سینٹ سائمن کا کہنا تھا کہ صنعتی نظام کے باعث اب امراء اور جاگیرداروں کی افادیت ختم ہو چکی ہے اور پادریوں کی بھی جو روحانی پیشوا تھے اب ضرورت باقی نہیں رہی لہٰذا معاشرے کی نئی تنظیم سائنس اور صنعت کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ رابرٹ اووین، چارلس فوریئر اور بہت سے مادی فلسفی انہی لائنوں پر سوچ رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سائنسی اسلوب کے ذریعے معاشرے کے ارتقا کے قوانین بھی دریافت کیے جائیں اور اس طرح جنم لینے والی معاشرتی سائنس کو معاشرتی مسائل کے حل کے لیے کیوں نہ استعمال کیا جائے۔

وہ یہ تو جان گئے تھے کہ سائنس ذرائع پیداوار کو بدل ڈالتی ہے اور کسی بھی دور میں پیداوار کے دستیاب تکنیکی ذرائع اس دور کے سماجی نظام کی حدیں مقرر کرتے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ جس طرح سائنسی اسلوب مادی کائنات کو سمجھنے میں مددگار ہوتا ہے اس طرح سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنے میں بھی مددگار ہوگا۔

جدید سائنس کا آغاز

انیسویں صدی میں طبیعات، کیمیا اور حیاتیات کی تحقیق میں اس قدر وسعت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ جداگانہ ضمنی سائنسی علوم بن چکے تھے۔ ان کے دائرہ تحقیق کا میدان الگ ہونے سے ان علوم کی ترقی کی رفتار بھی تیز ہو گئی تھی۔

مادہ، مادے کی ساخت اور مادے میں تبدیلی کے قوانین پر تحقیق کیمیا کے حصے میں آئی۔ ابتدا اس کی گیسوں پر کام سے ہوئی۔ مردہ آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں پر، بند غاروں اور شراب سازوں کے گڑھوں میں ایسی گیس پائی جاتی تھی جو کبھی کبھی آگ کے الاؤ یا مزدوروں کے دم گھٹنے کی شکل میں ظاہر ہوتی تھیں۔ ہیلمانٹ انہیں آوارہ یا سرکش روحیں کہا کرتا تھا، ان پراسرار گیسوں کے مطالعہ سے کیمیائی تشریح کے لیے کئی راز ہاتھ آئے۔ ہیلز نے بتایا کہ کس طرح یہ گیسیں پانی کے اوپر اکٹھی کی جاسکتی ہیں اور ان کی پیمائش بھی کی جاسکتی ہے۔ اس وقت تک ہوا کو ایک عنصر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ہیلز کے تجربوں کے بعد پتہ چلا کہ ہوا مرکب ہے کئی گیسوں کا مجموعہ ہے۔ ساری گیسیں اپنے خواص کے لحاظ سے بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سب سے اہم پیش رفت یہ ہوئی کہ جب کسی کچ دھات کو پگھلا کر یا کسی دوسرے کیمیائی عمل سے خالص دھات میں تبدیل کیا جاتا تو اس کے وزن اور حجم کی پیمائش کی جاتی۔ اس تبدیلی میں ملنے والے اور خارج ہونے والے تمام اجزاء کا پتہ لگایا جاتا۔ کسی کیمیائی عمل میں حصہ لینے والی اور خارج ہونے والی گیسوں کی پیمائش یا وزن کے بغیر کیمیا کے کھاتوں کا حساب برابر نہیں ہوسکتا تھا۔

جب ہر تجربے ہی میں ایسا ہوا کہ تعاملات اور حاصلات ہمیشہ برابر نکلے تو ان تجربات نے جس قانون قدرت کی راہ ہموار کی اسے قانون بقائے مادہ کہتے ہیں۔ اس قانون کی رو سے مادہ

ایک مستقل حقیقت ہے مادہ نہ تو پیدا کیا جا سکتا ہے نہ ہی فنا کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہمیشہ مستقل رہتا ہے۔ اس کے بعد لیوائزے نے کیمیاوی عمل میں حصہ لینے والے عناصر کی مقدار خرچ و بچت کی پرکھ سے متوازن مساواتوں کے ذریعے کیمیا کو ایک ریاضیاتی شغف بنا دیا۔ قانون بقائے مادہ کی مدد سے اب کیمیائی ری ایکشنوں کی پیش گوئی بھی ان کی مقداری اور پیمائشی پہلوؤں سمیت ممکن ہو گئی۔ پھر تو ایک ایٹم تو کیا ایٹم کے بطن میں موجود ایک ایک برقی ذرے کا حساب رکھنا ممکن ہو گیا۔

کیمیا نے پہلی مرتبہ قانون بقائے مادہ کے ذریعے کلاسیکی مادئین کے اس دعویٰ کی تجربی تصدیق پیش کر دی کہ مادہ مستقل ہے۔ قائم بالذات ہے۔ مادے کو نہ پیدا کیا جا سکتا ہے نہ فنا کیا جا سکتا ہے۔ مادہ اپنی ظاہری حالت تبدیل تو کر لیتا ہے مگر اپنا وجود قائم رکھتا ہے۔ پانی کو خواہ برف بنا کر ٹھوس مادے کی شکل دے دیں یا ابال کر بھاپ میں تبدیل کر دیں اس کا ایک ایک ذرہ قائم و دائم رہتا ہے۔ جب ہم کاغذ یا لکڑی کو جلاتے ہیں تو بظاہر ایسا لگتا ہے کہ لکڑی جل کر راکھ ہو گئی مگر جب ہم جلنے کے عمل میں خرچ ہونے والی آکسیجن اور نتیجے میں بننے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ، نمی اور راکھ کا وزن کریں تو وہ اس لکڑی جتنا ہی ہو گا جس کو جلایا گیا ہے۔ اس کے بعد دھاتوں کے آگ میں جلنے اور کچھ دھاتوں کے زمین میں زنگ آلود ہو کر خاکستر بن جانے پر تجربے کیے تو ثابت ہو گیا کہ ایک ذرے کا لاکھواں حصہ بھی فنا نہیں ہوتا۔ اپنی شکل خواہ تبدیل کر لے اپنا وجود ہمیشہ قائم رکھتا ہے۔

یہ بنیاد تھی سائنس کے مادے پر یقین کی کہ یہ ایک مستقل حقیقت ہے۔ جوزف بلیک نے چونے کے پتھر جیسے کاربونیٹ اور میگنیشیا کو گرم کر کے ان سے نکلنے والی گیسوں کا حساب لگایا۔ ان کی شناخت کی اس نے انہیں منجمد ہوا (Air) کہا کیونکہ اسے چونے کے پانی میں جذب کرنے سے دوبارہ پہلے والا کاربونیٹ بن جاتا ہے اس کا وزن پھر اتنا ہی ہو جاتا ہے جتنا گرم کرنے سے پہلے تھا۔

پھر لیوائزے نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور بتایا کہ ٹھوس مادے کس طرح مختلف مقداروں میں آپس میں ملکر انواع واقسام کے اربوں کھربوں مرکبات بناتے چلے جاتے ہیں۔ پھر قانون بقائے مادہ کے ذریعے ان کی تشریح کی۔ اس سے پہلے کیمیا جو قیاسوں اور راہبانہ الکیمی کے بین بین تھی اب اس میں پیمائش کا تصور عام ہو گیا تھا۔

آج بھی فلسفہ مادیت کو سمجھنے کے لیے کیمسٹری کی اہمیت بنیادی ہے۔ ہماری نصابی کتب

میں کیمسٹری کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ کیمسٹری سائنس کی وہ شاخ ہے جو مادے کی ساخت، مادے میں رونما ہونے والی ظاہری اور باطنی تبدیلیوں اور ان قوانین و ضوابط کا مطالعہ کرتی ہے جن کے تحت یہ تبدیلیاں رونما ہو رہی ہوتی ہیں کیمسٹری نے اب تک جو سفر طے کیا تھا اس کے مطابق کائنات مادے سے بنی ہے۔ مادہ عناصر سے بنا ہے اب تک کائنات میں قدرتی طور پر پائے جانے والے 92 عناصر دریافت ہو چکے ہیں۔ عناصر ایٹموں سے بنے ہیں کسی ایک عنصر کے ایٹم حجم، شکل اور وزن کے لحاظ سے آکسیجن ایک جیسے ہوتے ہیں جبکہ کسی دوسرے عنصر کے ایٹموں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایٹم مادے کی بنیادی اکائی ہے جس طرح اینٹ مکان کی بنیادی اکائی ہے جس طرح خلیہ جسم کی بنیادی اکائی ہے ایک عنصر کے ایٹم دوسرے عناصر کے ایٹموں سے ملنے کی کشش رکھتے ہیں اس کشش کی وجہ سے وہ دوسرے عناصر کے ایٹموں سے مخصوص مقدار میں مل کر مرکبات بناتے ہیں اس کائنات میں جو گونا گونی، رنگا رنگی ہے وہ انہی اربوں کھربوں مرکبات سے ہے۔ بے جان مادے میں موجود عناصر کے مطالعہ کو غیر نامیاتی کیمیا کہا جاتا ہے۔

نہ صرف یہ کہ ساری کائنات ان گنت مرکبات سے بنی ہوئی ہے بلکہ حیات ارضی بھی انہی مرکبات ہی کی پیداوار ہے اس حقیقت کا انکشاف اس طرح ہوا کہ جو نایات خوشبویات، مہنگے رنگ جو ٹیکسٹائل انڈسٹری کا حصہ تھے انہیں پودوں اور جانوروں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ اون بھیڑوں اور ریشم کیڑوں سے حاصل کیا جاتا۔ ادویات کے لیے جڑی بوٹیاں اور ان سے حاصل کردہ کیمیکل کو استعمال کیا جاتا۔ پودوں اور جانداروں میں پائے جانے والے مرکبات کے مطالعے کے لیے الگ کیمسٹری تھی ان کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ جانداروں میں پائے جانے والے مرکبات ترکیب اور خواص کے لحاظ سے اس لیے الگ ہیں کہ ان کو بنانے میں روح اہم کردار ادا کرتی ہے۔ روح چونکہ مادی کائنات کا حصہ نہیں وہ عالم بالا سے آتی ہے اس لیے ایسے مرکبات جو جانداروں میں پائے جاتے ہیں انہیں لیبارٹری میں نہیں بنایا جا سکتا۔ اسے (vital force) کا نظریہ کہتے ہیں۔

دو سو سال تک یہ سائنسی نظریہ عقیدے کی طرح آخری سچائی سمجھا جاتا رہا کہ جانداروں میں پائے جانے والے نامیاتی مرکبات وائٹل فورس کے عمل ہی سے بن سکتے ہیں۔ مگر یہی مرکبات اب لیبارٹری میں تیار ہونے لگے۔ اون، ریشم، خوشبویات، رنگ اور ادویات، حتیٰ کہ ممالیہ جانوروں کے جسم سے خارج ہونے والے یوریا کو جب لیبارٹری میں بنا لیا گیا تو غیر نامیاتی

مرکبات کی طرح نامیاتی مرکبات بھی لیبارٹری میں بننے لگے اور وائٹل فورس تھیوری کا اختتام ہو گیا۔ ہر وہ مرکب جو جاندار میں پایا جاتا ہے اس میں موجود ایٹموں کی شناخت، مقدار اور باہمی ترکیب بھی معلوم کر لی گئی۔

اس طرح غیر جاندار مرکبات سے نامیاتی مرکبات اور نامیاتی مرکبات کے مطالعے سے نامیاتی کیمیا کا آغاز ہوا جو بائیو کیمسٹری تک چلا گیا پھر اس کا دائرہ حیاتیات کے سائنسی مطالعہ تک وسیع ہو گیا۔ DNA کی تحقیق اور اس کے کوڈ کھولنے تک انسانی علم کی رسائی نے اس حقیقت کو آشکار کر دیا کہ اس زمین پر موجود تمام قسم کی زندگی خواہ وہ نباتات ہوں، حیوانات یا انسان یا سمندری زندگی ہو سب کے سب اسی مٹی کے کیمیاوی مادوں سے پیدا ہوئے ہیں۔

سائنسدانوں نے طبیعات کے شعبے میں 19 ویں صدی کا سب سے اہم کارنامہ توانائی کی وحدت کے اصول کی دریافت کو قرار دیا ہے۔ میکانکی کام، بجلی اور حرارت کی قسم کی توانائی کی مختلف شکلیں تو پہلے ہی دریافت ہو چکی تھی، لیکن انیسویں صدی میں تھرموڈائنامکس کی ترقی سے پتہ چلا کہ توانائی کی تمام صورتیں یا قدرت کی تمام قوتیں۔ مادی حرکت، روشنی، آواز، حرارت، برق و مقناطیسیت جن کو پہلے الگ تھلگ خیال کیا جاتا تھا وہ باہمی طور پر قابل تبادلہ بھی ہیں اور توانائی کی ایک ہی جیسی اکائیوں میں قابل پیائش بھی ہیں۔ پھر ان کی پیائش کو ریاضیاتی شکل بھی دے دی گئی۔ جس سے توانائی کی وحدت کا اصول سامنے آیا کہ ہر قسم کی توانائی مختلف شکلیں رکھنے کے باوجود ایک ہی پیمانے پر قابل پیائش ہے۔ پھر اسی اصول کی مزید نکھری ہوئی شکل سامنے آئی کہ توانائی ناقابل فنا ہے یہ مختلف شکلوں میں ادلتی بدلتی رہتی ہے لیکن کائنات میں اس کی مقدار مستقل رہتی ہے نہ زیادہ ہوتی ہے نہ کم۔ یہ انیسویں صدی کی طبیعات کے شعبے کی سب سے بڑی پیش رفت تھی جو قانون بقائے توانائی کی شکل میں سامنے آئی۔ اس سے پہلے کیمیا نے قانون بقائے مادہ کی دریافت کی وجہ سے تحقیق کی نئی راہیں کھولی تھیں۔ طبیعات کے توانائی کے قانون کی دریافت نے سائنس کے کئی علوم کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیا تھا۔ اب توانائی ایک ایسی عالمگیر اکائی قرار پائی جو کائنات میں ہونے والی تبدیلیوں کے باہم موازے کا پیمانہ بنی۔ جس طرح زرمبادلہ کے ذریعے دنیا میں مختلف چیزوں کی مالیت کو اس زمانے میں سونے کی قیمت کے معیار پر پرکھا جاتا تھا۔ قانون بقائے مادہ اور قانون بقائے توانائی کی دریافت نے آگے چل کر اس کائناتی اصول کی

راہ ہموار کی کہ مادہ اور توانائی بھی آپس میں قابل تبادلہ ہیں۔ توانائی مادے سے کوئی الگ یا دوسری چیز نہیں ہے۔ یعنی مادہ اور توانائی ایک ہی وجود کے دو اظہار ہیں۔ توانائی کسی بھی شکل میں ہو مادہ ہی اس کا واحد منبع ہے۔

مادیت کے نظام فکر کو طبیعات اور کیمیا کی دریافتوں نے تجربی تصدیق کے ذریعے پایہ ثبوت کو پہنچایا وہ باتیں جو کلاسیکی مادئین نے اپنے اندازے اور قیاس کی بنیاد پر کہی تھیں انہیں سائنسی صداقت کے درجے تک لے آئے۔ مادے کے بارے میں وہ باتیں جو فلسفی بتایا کرتے تھے اب سائنس کا موضوع بن گئی تھیں۔

بجلی اور مقناطیس کے ملاپ سے برقی موٹروں اور پھر برقی موٹروں سے پاور انجینئرنگ نے سائنس کو منافع بخش پیداواری علم تو بنا ہی دیا تھا مگر سب سے عظیم ثمرات سائنس کی وجہ سے یہ ہوئی کہ سائنسی تحقیق نے مادے کے متعلق تمام تر تصورات کو بدل دیا۔ یہ انیسویں صدی کی سب سے عظیم کامیابی تھی کہ اب مادہ بے جان بے حرکت مردہ اور جامد شے نہیں رہا تھا بلکہ مادہ انتہائی چھوٹے چھوٹے متحرک ذرات ان ذرات کے اندر برقی ذرات کی آپس میں کشش کی وجہ سے حرکت۔ لہروں اور توانائی پیدا کرنے والے ذروں اور پھر اسی توانائی سے مادے کی اندرونی حرکت جاری رکھنے کا ایک پورا سسٹم موجود تھا۔ مخالف برقی چارج رکھنے والے ذروں کا ساکن رہ کر آپس میں ایک دوسرے کو فنا کر دینے کی بجائے حرکت میں رہ کر اپنا وجود قائم رکھنے اور نظام شمسی طرز کے ایک سسٹم کی ایک ایٹم میں موجودگی نے مادے کی تعریف ہی کو بدل دیا تھا۔ اب مادہ جگہ گھیرنے اور وزن رکھنے والی شے کا نام نہیں تھا بلکہ برق و لہروں کے ایک نہ ختم ہونے والے تغیرات کے سلسلے کا نام تھا۔

قانون ارتقا

انیسویں صدی آئی تو مادے سے متعلق بہت سی سائنسی دریافتیں اور انکشافات ہو چکے تھے یہ دریافت یہ انکشاف مادئین کے دعوؤں کی تجربی تصدیق کرتے چلے جارہے تھے ۔ یہ دریافتیں یہ انکشافات ایک تو مادے کی ساخت کے بارے میں تھے دوسرے مادے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے قوانین اور ضابطوں سے متعلق تھے۔ قانون بقائے مادہ نے ثابت کر دیا تھا کہ مادہ حقیقی وجود رکھتا ہے۔ قائم بالذات ہے۔ نا قابل فنا ہے۔ پھر توانائی کی تمام تر شکلیں دریافت ہوئیں تو پتہ چلا کہ ہر قسم کی توانائی کا تعلق مادے سے ہے۔ مادہ اور توانائی آپس میں قابل تبدیل ہیں مادے کی ساخت کے بارے میں دریافت ہوا کہ مادہ جن چھوٹے چھوٹے ذرات سے مل کر بنا ہے جنہیں ایٹم کہتے ہیں سوئی کی نوک پر لاکھوں کی تعداد میں آسکتے ہیں وہ ذرات بیرنگ کی گولیوں کی طرح کوئی ٹھوس ذرے نہیں ہیں بلکہ ہر ذرہ مخالف چارج رکھنے والے مزید چھوٹے ذرات کا ایک پورا سسٹم ہے۔ جس میں مخالف برقی چارج ایک دوسرے کو زائل کر کے سسٹم کو تباہ کر دینے کی بجائے مسلسل حرکت میں رہ کر اپنا وجود برقرار رکھتے ہیں۔ ان کی حرکت سے توانائی خارج اور جذب کرنے کا نظام دریافت ہو چکا تھا۔

اس پر اضافہ یہ کہ ہر قسم کی زندگی کی نمود زمین ہی کے نامیاتی مادوں سے ہوئی۔ جو ایک درخت کی شاخوں کی طرح ہر سمت پھیلتی ہوئی ہزاروں لاکھوں قسم کی انواع میں تقسیم ہو گئی۔ ان دریافتوں اور انکشافات سے یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچی کہ کائنات بار بار ایک ہی تکراری عمل کو دہرانے والی مشین نہیں۔ بلکہ مسلسل تبدیلیوں کے ذریعے بتدریج آگے بڑھتا ہوا ایک سلسلہ ہے۔ نا قابل واپسی تبدیلیوں کا یہ سلسلہ وقت آنے پر تسلسل کو توڑ کر اچانک ایک چھلانگ کے ذریعے

ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

ان تمام تر کامیابیوں میں سب سے بڑی کامیابی جس کی طرف سائنس کی دریافتیں اور انکشافات بڑھے تھے وہ تھی "مادے کی ساخت میں موجود حرکت و تبدیلی کے خودکار نظام" کی دریافت۔ یہ کائنات جو مسلسل تبدیلی اور ارتقائی مراحل سے گزر رہی ہے اس کا سبب کیا ہے؟ ہر چیز جیسی آج ہے پہلے نہ تھی۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ہونے والی تحقیق اور کائنات کی وسعتوں پر ہونے والے کام سے یہ بنیادی حقیقت آشکار ہو گئی تھی کہ مادہ ارتقا پذیر ہے۔ یہ ارتقا حادثاتی نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے بھی مادی قوانین کارفرما ہیں۔ قانون ارتقا کی دریافت سے مادے کی ساخت میں موجود حرکت و تبدیلی کے خودکار نظام کو سمجھنے کی راہ ہموار ہوئی۔

اگر ہم حیاتیات کے شعبہ میں استعمال ہونے والی سائنسی اصطلاحات کی بجائے عام فہم پیرایہ میں سمجھنا چاہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جاندار ابتدا میں کچھ اور تھے پھر وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ نئی شکل و جسامت کے ساتھ وہ اپنی زندگی کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان تبدیلیوں کے راز معلوم کرنے میں علم الارضیات کی دریافتوں نے آسانیاں پیدا کیں۔

ہر قسم کی زندگی کی ابتدا خلیہ سے ہوئی۔ جو آگے بڑھتے بڑھتے تقسیم در تقسیم کے عمل میں انواع و اقسام کے جانداروں تک پہنچی۔ ہر خلیہ ایک جاندار اکائی ہے۔ جانداروں کے خلیوں میں دو قسم کی قوتیں کیمیائی مادوں کی شکل میں پائی جاتی ہیں۔

1۔ ایک طرح کے کیمیائی مادے یا قوت خلیہ میں پچھلی نسل سے ملی ہوئی خصوصیات اور فیچرز کو اگلی نسل میں بھی جوں کا توں برقرار رکھنے پر سارا زور صرف کرتی ہے اسے توارث (Heredity) کہتے ہیں

2۔ دوسری قسم کے کیمیائی مادے یا قوت خلیہ میں اپنے اردگرد کے ماحول سے تبدیلی کا مواد جذب کرتی ہے تبدیل شدہ خلیہ کے مشابہ خلیہ پیدا کرتی ہے پھر اس تبدیلی کو کروموسوم کے ذریعے اگلی نسل کو منتقل کر دیتی ہے۔ نئی تبدیل شدہ نسل پھر اسی عمل سے گزرتی ہے اور غیر محسوس طریقے سے بدلتی چلی جاتی ہے، اسے تغیر کہتے ہیں۔

تبدیلی اتنی آسانی سے رونما نہیں ہوتی۔ توارث اور تغیر کی دونوں مخالف قوتیں ایک دوسرے سے مسلسل برسرپیکار رہتی ہیں۔ تصادم کی کیفیت میں رہتی ہیں۔ ایک دوسرے پر غالب

آنے کے لیے ان کے درمیان جنگ وجدل جاری رہتا ہے۔ ان کے درمیان جدل کے نتیجے میں ہمیشہ نئی کیفیتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ توارث ایک قیام پذیر اور جمودی قوت ہے۔ جو ماضی کی حالت پر برقرار رکھنے کے لیے اپنی تمام تر توانائی صرف کرتی ہے۔ اگلی نسل کو پچھلی نسل کی حالت پر برقرار رکھنے پر سارا زور صرف کرتی ہے تغیر و تبدیلی یا آگے بڑھنے کا راستہ روکنے پر بضد ہوتی ہے۔

اس کے برعکس تغیر ایک ایسی قوت ہے جو نئے حالات نئی ضرورتوں کے مطابق ڈھل جانے پر تبدیلی کو جذب کرنے پر سارا زور صرف کرتی ہے۔ تبدیلی ایک بتدریج اور سلسلہ وار عمل ہے۔ جس کا تبدیلی کے اثرات کو ماحول سے جذب کر کے اگلی نسل کو منتقل کرنا اٹل ہے۔

توارث اور تغیر کی کشمکش کے درمیان تبدیلی کا عمل اگرچہ بہت سست رہتا ہے، مگر بتدریج آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اگر توارث یا جمود اٹل ہوتا تو کروڑوں سال پرانی دنیا آج بھی ویسی ہی ہوتی جیسی کروڑوں سال پہلے تھی۔ تبدیلی و تغیر فطرت کا اٹل قانون ہے اور اس کا سبب جاندار اور بے جان مادے کی ساخت میں مخالف اور متضاد قوتوں کو آپس کی لڑائی یا جدل ہے اگر ہم مادے کی ساخت کو دیکھیں تو مادہ عناصر سے بنا ہے اور عناصر ایٹموں سے بنے ہیں۔ ایٹم مزید چھوٹے چھوٹے برقی ذرات سے مل کر بنا ہے جن میں کچھ اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے مسلسل حرکت میں رہتے ہیں۔ اگر وہ ساکن ہو جائیں تو ایٹم کا سسٹم تباہ ہو جائے۔ یوں سمجھیئے کہ ایٹم توانائی جذب اور خارج کرتے ہوئے متحرک مخالف برقی چارج رکھنے والے ذرات کا ایک نامکمل نظام ہے جو اپنی تکمیل کے لیے مختلف عناصر کے ایٹموں سے مل کر اربوں، کھربوں قسم کے مرکبات بناتا چلا جاتا ہے۔ مادی کائنات اپنی ساخت میں موجود مخالف اور متضاد قوتوں کی آویزش، چپقلش اور جدل کے نتیجے میں تبدیلی و تغیر کا ایک خودکار نظام رکھتی ہے۔ اسے قانون ارتقا کہتے ہیں۔ سارا ارتقائی عمل متضاد قوتوں یا رجحانات کی اندرونی کشمکش سے پھوٹتا ہے اور اس کشمکش کے نتیجے میں تیسرا اور نیا مظہر پیدا ہوتا ہے۔ نیا مظہر کچھ عرصے کے لیے غالب حیثیت میں قائم رہتا ہے آخر کار وہ بھی اندرونی تضادات کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ جسے پروسیس (Proces) بھی کہا جاتا ہے۔ مادہ ایک پروسیس کا نام ہے۔

معاشرے اور فکر کا قافلہ ارتقا بھی اندرونی متضاد قوتوں کے باہمی جدل کے نتیجے میں ہمیشہ کیفیتی تبدیلی کے پیدا ہوتے رہنے کے عمل کا تسلسل ہے۔ معاشرے افکار اور مادی دنیا کی ساخت میں موجود متضاد قوتوں کا جدل ہی وہ خودکار نظام ہے جو مادے کو اندرونی عامل کے طور پر متحرک رکھتا ہے۔

تسخیر مادہ

مادے کی ساخت پر ہونے والی سائنسی تحقیق کے دوران تین اہم انکشافات ہوئے جن کی وجہ سے مادے ہی کے بارے میں ہمارے تصورات یکسر تبدیل ہو گئے یا یوں کہیے حقیقت کے قریب ترین ہو گئے۔

1۔ ہزاروں سال سے مادے کو ایک ایسی شے کے طور پر جانا جاتا تھا جو وزن رکھتی، جگہ گھیرتی ہو۔ ہمارے ذہن کے باہر اپنا آزاد وجود رکھتی ہو۔ شے کو ہم اگر گہرائی میں سمجھنا چاہیں تو مخصوص شکل رکھنے والی، چند خصوصیات کی حامل، بنی بنائی، قیام پذیر، جامد اور مستقل چیز کا نام ہے۔ جو ہمیشہ کے لیے ایک ہی حالت پر تھی اور آئندہ ہمیشہ کے لیے ایسی حالت پر رہنے والی تھی۔

لیکن تسخیر مادہ میں پیش رفت کے بعد مادہ اب شے نہیں پروسیس کا نام ہے۔ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتا ہوا مسلسل عمل۔ ایک وقت کے لیے وہ ایک شکل میں ہو اور دوسرے وقت وہ کسی اور شکل میں تبدیل ہو جائے، ایک حالت سے دوسری حالت کے سفر میں ہو۔ اس ایک حالت کا دورانیہ لمحوں پر مشتمل بھی ہو سکتا ہے اور ہزاروں سال پر بھی محیط ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی شے جو ایک وقت کے لیے آپ کے زیر مشاہدہ ہے وہ دراصل تبدیلیوں کے عمل سے گزرتی ہوئی شے کی ایک حالت ہے۔ پروسیس میں رہنے والی شے مستقل ایک ہی حالت میں نہیں رہ سکتی۔ بنتی ہے، بگڑتی ہے، تبدیل ہو جاتی ہے نئی حالت پر آ جاتی ہے۔

شے اور پروسیس کے فرق کو ہم ایک روزمرہ مثال سے سمجھتے ہیں۔ لوہا جس سے آپ کے گھر کا گیٹ بنا ہوا ہے ایک شے ہے یعنی لوہے کا گیٹ ہے۔ لوہا زمین میں مٹی کی شکل میں موجود تھا۔ اسے کچے دھات کہا جاتا تھا۔ مزدوروں نے ٹرالیوں پر لاد کر کان سے فیکٹری میں پہنچایا وہاں یہ

خام مال تھا۔ یہاں اسے پگھلایا گیا اور سرخ دہکتے ہوئے لاوے میں تبدیل ہو گیا ۔ مائع کی شکل میں تھا۔ پھر اس پگھلے ہوئے لاوے کو سانچوں میں ڈھال کر اس کے بلاک، چادروں کی شکل میں جما دیا گیا۔ یہ جما ہوا لاوا اب برتنوں چھتوں کے سامان، بحری جہازوں، ریلوے انجن، ٹریکٹر اور دیگر مشینری میں تبدیل ہو گیا ہے۔ جن میں آپ کے گھر کا گیٹ بھی ایک شکل ہے۔ ایک وقت کے بعد آپ کے گیٹ کو زنگ لگنے لگا اس میں جگہ جگہ سوراخ ہونے لگے۔ آپ کو گیٹ کی مخدوش حالت سے عدم تحفظ کا احساس ہوا۔ آپ نے گیٹ کباڑیے کو بیچ دیا۔ کباڑ والے نے سارا پرانا لوہا کسی دوسری فیکٹری کو بیچ دیا جہاں وہ پھر اس قابل ہو گیا کہ اس کی کارآمد چیزیں تیار کی جا سکیں۔ مادہ نا قابل فنا ہے۔ نہ تخلیق کیا جا سکتا ہے نہ اس کا وجود ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک حالت سے دوسری میں تبدیل تو ہو جاتا ہے مگر فنا نہیں ہوتا۔ ازل سے ہے ابد تک رہے گا۔ اب آپ کے گیٹ کے لوہے کی کچھ اور چیزیں بن گئیں۔ لکڑی کے دروازے کا قبضہ۔ جو ٹوٹ کر گرا اور زمین میں زنگ کی شکل میں حل ہو گیا۔ یہی لوہا زمین پر اگنے والی پالک اور قلیل مقدار میں دیگر سبزیوں میں چلا گیا یہاں تک کہ خون میں سرخ جسیمہ بن کر شامل ہو گیا۔ یہ سلسلہ کسی ایک حالت پر تھوڑی دیر قیام پذیر رہا ہو گا پھر آگے بڑھنا اس کا مقدر ٹھہرا۔ مادہ کس لمحے کس حالت میں ہے کس زمانے میں کس جگہ پر وہ کیا شے ہے؟ ہر مادی شے کی ایک تاریخ ہے ایک کہانی ہے ایک تسلسل ہے۔ یہاں تک کہ ہماری زمین کا نظام شمسی کے سیارے کے طور پر وجود میں آنا بھی اس طرح کی ایک کہانی ہے۔ تسخیر مادہ کی اس دریافت کے مطابق مادہ شے نہیں ازل سے ابد تک تبدیلی کے عمل سے گزرتا ایک پروسیس ہے۔

کائنات کی ہر شے ایک پروسیس ہے۔ ایک وقت میں ایک شے۔ کپڑے ہی کو لیجیے جو آپ نے پہنا ہوا ہے یہ ایک بیج سے پھوٹنے والا پودا تھا ایک خاص مدت کے بعد اس پودے پر پتے ٹہنیاں کونپلیں شگوفے لگے۔ پھول کھلے اور کپاس کی چاندی کھیت میں چاروں طرف کھل گئی ۔ کھیت مزدور عورتوں نے انہیں چن کر گٹھڑی میں ڈالا اور زمیندار کے گودام پر پہنچایا۔ یہ کپاس غلہ منڈی میں آڑھتی کے ذریعے پاور لوم تک پہنچی اور اس سے بنایا گیا سوت ٹیکسٹائل مل کا مہمان ٹھہرا ۔ یہ کپڑا تھان کی شکل میں پھر بازار آ گیا جسے آپ نے خرید کر درزی کو دیا۔ اب آپ کے جسم کی زیبائش کا کام کرے گا اور ایک وقت کے بعد پھر کسی اگلی مرحلے میں داخل ہو جائیگا۔

مادے کی ساخت میں بھی ایسی تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں نا قابل واپسی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ دھاتیں ہاف لائف کے بعد کسی دوسری دھات میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ مرکبات بنتے ٹوٹتے، نئے مرکبات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں ساری کی ساری مادی کائنات ایک پروسیس میں ہے۔ تبدیلی کے عمل سے مسلسل گزر رہی ہے۔ بلیک ہول بھی ایک ایسی ہی کہانی بیان کرتے ہیں۔

2۔ تسخیر مادہ کے دوران ہونے والے انکشافات میں دوسرا اہم تر انکشاف حرکت کا تصور ہے۔ حرکت کی تعریف یوں کی جاتی ہے کسی مادی شے کے اپنے اردگرد کی چیزوں کے لحاظ سے مسلسل جگہ تبدیل کرنے کو حرکت کہتے ہیں۔

حرکت کا تصور اور اس کے قوانین نیوٹن کی میکانیات سے ماخوذ ہیں۔ نیوٹن کے دریافت کردہ حرکت کے پہلے قانون کے مطابق کوئی بھی مادی شے کسی مادی بیرونی عامل کے اثر انداز ہوئے بغیر ہمیشہ ساکن رہے گی اور کوئی بھی پہلے سے متحرک شے کسی مادی بیرونی عامل کے اثر انداز ہوئے بغیر کبھی ساکن نہیں ہو سکتی۔

تسخیر مادہ کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ ایک ہی جگہ پر ساکن رہنے والا مادہ بھی ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اسے آپ اپنی سہولت کے لیے داخلی حرکت کہہ سکتے ہیں۔

کبھی آپ نے لوہے کا ٹکڑا زمین پر زنگ بن کر زمین میں گھل جاتا ہوا دیکھا ہو گا کبھی کسی کلر کی وجہ سے پتھر جیسی اینٹ کو آٹا بن کر مٹی میں تحلیل ہوتے دیکھا ہو گا جب کبھی انڈے سے چوزہ بنتے اور بیج سے پودہ اگنے کو داخلی حرکت و تبدیلی کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا تو روح کو بطور بیرونی عامل تبدیلی کا ذمہ دار قرار دے دیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے روح کا تصور ہی دنیا کے تمام تر مذاہب کی بنیاد ہے۔

اب یہ بات ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ بے جان مادہ بھی داخلی حرکت کے بغیر وجود نہیں رکھتا۔ اس کو سمجھنے کے لیے ڈھلوان کی طرف لڑھکتے ہوئے پتھر کا تصور ذہن میں لائیے۔ آپ کو دو چیزیں نظر آ رہی ہیں (۱) پتھر (۲) حرکت۔ آپ اکیلے ساکن پتھر کا تصور تو ذہن میں لا سکتے ہیں کیونکہ یہ مادی وجود رکھتا ہے پتھر کو ذہن میں لائے بغیر حرکت کا تصور یا حرکت کو پتھر سے الگ

تھلگ ایک وجود کے طور پر اس کا تصور ذہن میں نہیں لا سکتے۔ جس طرح حرکت کا وجود کسی مادی چیز کے حرکت میں آئے بغیر ممکن نہیں اس طرح مادے کا وجود داخلی حرکت کے بغیر ممکن نہیں۔ مادے میں داخلی حرکت ہی اس کے وجود اور ارتقاء کا اٹل قانون ہے۔

3۔ تسخیر مادہ کا تیسرا اور اہم ترین انکشاف تمام تر مادے کا آپس میں مربوط ہونا ہے یعنی کائنات کے ہر مادی جزو کا کائنات کے مادی کل کے ساتھ جڑا ہوا ہونا۔ آپ دنیا کی کسی بھی مادی شے کو الگ تھلگ تصور نہیں کر سکتے۔ تسخیر مادہ کی اس دریافت کے مطابق ہر مادی شے اپنے اردگرد مادی اشیاء اور ماحول سے جڑی ہوئی ہے۔ کسی بھی زیر مشاہدہ چیز (System) کو اس کے ماحول (Surroundings) سے کاٹ کر درست نتائج تک نہیں پہنچا جا سکتا۔

آپ کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کوئی چیز اگر چھوٹ جائے تو وہ زمین پر اس لیے گرتی ہے کہ وہ پہلے سے زمین کے ساتھ کشش ثقل کے رشتے میں جڑی ہوئی تھی۔ آپ کا ہاتھ ان کے رشتے کے درمیان رکاوٹ تھا کسی چیز کا وزن بھی درحقیقت اس چیز پر اثر انداز ہونے والی کشش کی پیمائش ہے۔

سائنس سے ہٹ کر اگر ہم روزمرہ زندگی کے تجربے سے اسے سمجھنا چاہیں تو برف کو دیکھ لیجئے۔ اگر آپ کسی گلیشئر کے قریب رہتے ہیں تو برف صدیوں برف ہی کے طور پر اپنا وجود قائم رکھ سکتی ہے۔ اگر آپ پاکستان میں رہتے ہیں اوپر سے جون کا مہینہ ہے تو برف کی زندگی برف کے طور پر عارضی اور فانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمین پر ہر قسم کی نباتاتی حیوانی اور انسانی زندگی کا وجود ہے۔ ہماری زمین نہ تو سورج کے اتنی قریب ہے کہ پانی وہاں ہمیشہ سورج کی گرمی کی وجہ سے بھاپ ہی رہے اور نہ ہماری زمین کا فاصلہ سورج سے اتنا زیادہ ہے کہ پانی ہمیشہ برف بن کر ٹھوس حالت میں جما رہے۔ زمین کے سورج سے مناسب فاصلے کی وجہ سے یہاں پانی تینوں حالتوں میں پایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں زندگی کے امکانات پیدا ہوئے۔ صرف زندگی ہی نہیں ہر غیر جاندار مادی شے بھی اردگرد کی مادی اشیاء سے کسی نہ کسی رشتے میں جڑی ہوئی ہے۔ ماحول سے ان رشتوں کی دریافت کو (Ecology) کہتے ہیں۔

ارتقا اور جدلیات

علم کے کسی شعبے یا کسی نظریے کا ظہور جس مخصوص جغرافیائی خطے میں ہوا ہو۔ اس علم کو اپنے اظہار اور وضاحت کے لیے الفاظ بھی اسی سرزمین سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اصطلاحات بھی علم یا نظریے کو جنم دینے والی سرزمین میں مستعمل زبان سے مل جاتی ہیں۔ کچھ عالمگیر نظریات جو کسی جغرافیائی خطے یا وقت کی قید سے آزاد ہوتے ہیں ان کا پھیلاؤ ساری دنیا میں ایک جیسا ہوتا ہے۔ جب یہ نظریات کسی دوسرے جغرافیائی خطے میں داخل ہوتے ہیں جہاں دوسری زبان بولی سمجھی جاتی ہے وہاں انہیں ترجمہ کر کے متعارف کروایا جاتا ہے۔ بعض اوقات دوسری زبان اتنی امیر نہیں ہوتی کہ اس میں ہم پلہ اصطلاحات یا معنی کو واضح کرنے والے الفاظ دستیاب ہوں۔ وہاں ان نظریات کی غلط تشریح یا کمزور تاویل ہو جانا ممکن ہے روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والے عام الفاظ کو اگر کبھی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جانے لگے تو ان کے معانی کا تعین لازمی ہو جاتا ہے۔

مذہبی پاکستان میں جہاں علم کو مابعد الطبیعات کی بنیادوں پر تعمیر کیا گیا ہو وہاں فلسفے اور سائنس کو اصطلاحات حاصل کرنے یا اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے عربی اور فارسی سے الفاظ کی بھیک مانگنا پڑتی ہے۔ جدلی مادیت جیسے عالمگیر نظریے کو بھی اس خطے میں کچھ ایسی ہی مشکلات کا سامنا ہے ارتقا کے اصطلاحی معانی سمجھنے کے لیے نشوونما اور ارتقا جیسے ہم معانی الفاظ کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ نشوونما کسی چیز کا بڑا ہونا، حجم یا سائز میں بڑھنا۔ پھلنا پھولنا، کمیت میں اضافہ یہ ایک مقداری تبدیلی ہوتی ہے جیسے ایک چھوٹا سا پودا نشوونما پا کر درخت بن جائے۔

ارتقا ایک ایسی بتدریج تبدیلی ہے جس میں مقدار بڑھتے بڑھتے۔ نشوونما کے ایک مرحلے پر اس کی کیفیت ظاہری حالت اور ہیئت بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ جیسے حشرات الارض میں تتلی کا

لاروا انڈے سے باہر آتا ہے تو اردگرد سے خوراک حاصل کر کے لمبائی میں بڑھتا رہتا ہے پھر ایک مرحلے پر وہ چلنا پھرنا بند کر کے ایک گول مٹول پیوپا میں تبدیل ہو کر شاخ کے ساتھ لٹک جاتا ہے اس پیوپا کے اندر نشوونما پا رہی تتلی ایک خاص مرحلے پر باہر جاتی ہے۔

تغیر یا تبدیلی دو قسم کی ہوتی ہے۔ جب کوئی شے اپنی اصل صورت میں رہ کر بدلتی ہے اسے مقداری تبدیلی یا نشوونما کہتے ہیں۔ جب وہ مقداری تبدیلی کے نتیجے میں اپنی صورت بدل کر دوسری صورت اختیار کر لیتی ہے اسے کیفیتی تبدیلی یا ارتقا کہتے ہیں۔

ہمارے جیسے گرم ممالک میں برف کا پانی بن جانا ہماری روزمرہ زندگی کا ایک تجربہ ہے۔ برف ایک ٹھوس سے ہے اگر ہم مصنوعی برف کا ٹکڑا شیشے کے دروازے پر ماریں تو وہ شیشے کو توڑ دے گا۔ برف پر فزکس کے وہ تمام قوانین لاگو ہوتے ہیں جو ٹھوس چیزوں سے متعلق ہیں۔ برف جب ماحول سے حرارت جذب کرتی ہے تو وہ پانی میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ برف کے بطن میں درجہ حرارت کی مقدار بڑھتے بڑھتے ایک مرحلے پر برف کے پانی میں تبدیل ہونے یا کیفیتی تبدیلی پر منتج ہوتی ہے۔

پانی پر فزکس کا کوئی ایسا قانون لاگو نہیں ہوتا جس کا تعلق ٹھوس سے ہو۔ اب کیفیتی تبدیلی کے بعد اس پر تمام وہ قوانین لاگو ہوتے ہیں جن کا تعلق مائعات سے ہے۔ لیکن اگر آپ اس پانی کو برتن میں ڈال کر آگ پر رکھ دیں تو درجہ حرارت کی بڑھتی ہوئی مقدار اس کو گیس میں بدل دیتی ہے۔ پھر اس پر فزکس کے وہ تمام قانون لاگو ہوتے ہیں جو گیس کی کیفیت میں موجود تمام تر چیزوں پر لاگو ہوتے ہیں، جب کوئی چیز مقداری تبدیلی سے معیاری تبدیلی میں داخل ہو اس قسم کی نشوونما کو ارتقا کہتے ہیں، کیمسٹری کے علم کی ترقی سے مادے کو بنانے والے عناصر کی دریافت ممکن ہوئی۔ عناصر کی اکائی ایٹم کی ساخت معلوم کر لی گئی، ایٹم میں موجود برقی ذرات، ان کی قسمیں، ان کے وزن اور ان پر برقی چارج کی پیمائش ہو گئی۔ الیکٹران کی حرکت سے پیدا ہونے والی توانائی کو ناپا گیا۔ جس سے تسخیر مادہ کا کام اور بھی آسان ہو گیا۔ مختلف عناصر کے ایٹموں میں ایک دوسرے سے ملنے کی صلاحیت اور اربوں کھربوں مرکبات کہ مادہ جن سے بنا ہوا ہے کا صحیح صحیح پتہ چلا لیا گیا۔ کیمیائی تعاملات جن سے پرانے مرکبات ٹوٹتے اور نئے مرکبات میں تبدیل ہو جاتے ہیں وہ مخالف برقی چارج رکھنے والے ایٹموں کے درمیان کشش کا نتیجہ ہے۔ مادے کی اس تصادم و ترکیب

میں پیدا ہونے والی توانائی یا ماحول سے جذب ہونے والی توانائی کی درست پیمائش ہو گئی۔ کیمیائی تعاملات سے یہ تو ثابت ہوا کہ مادے میں حرکت و تبدیلی میں کسی خیالی بیرونی عامل کا عمل دخل نہیں البتہ ماحول درجہ حرارت اور دباؤ کی شکل میں اس پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔

ڈارون کا کمال بھی یہی تھا کہ اس نے عضویہ (Organism) پر ماحول کی وجہ سے رونما ہونے والی تبدیلی کے ربط کو سمجھا۔ کیمیائی تعاملات سے کچھ چیزوں کا ٹوٹنا اور نئی شکل میں اپنے وجود کو قائم رکھنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مادے کو حرکت و تبدیلی دینے والی قوت یا مادے کی از خود حرکت کی وجہ اس کے بطن میں موجود متضاد قوتوں کی موجودگی اور ان کے درمیان ٹکراؤ ہے۔

سائنسی علوم کی ترقی سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ مادے کی ساخت میں ایک خودحرکتی نظام موجود ہے جو متضاد قوتوں کے اپنا اپنا وجود قائم رکھنے کی جدوجہد میں آپسی جدل کا نتیجہ ہے اس سے مادے کا سکونی، جمودی مابعدالطبیعاتی تصور تو ٹوٹ گیا مگر مادے کا یہ خودحرکتی نظام ارتقا کو ثابت نہیں کرتا تھا۔

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وقتی لاعلمی کے باعث یہ سمجھ لیا جائے کہ مادے کے بارے میں انسان کا علم مکمل ہو گیا ہے اور اب تک کے دریافتوں سے اخذ شدہ نتائج کو آخری اور مکمل سمجھ لیا جائے یہ سوال کہ مادے میں حرکت و تبدیلی تو جاری ہے لیکن کیا یہ تبدیلیاں اتفاقی، بے ہنگم اور حادثاتی ہوتی ہیں یا کسی قانون ضابطے اور اصول کے تابع رونما ہوتی ہیں۔ یہاں سے شروع ہوتی ہے مادے میں داخل حرکت کے عمومی قوانین کی سائنس جس کو جدلیات کہتے ہیں کی دریافت۔ جرمن فلسفی ہیگل نے جدلیات کے جو اصول دریافت کیے اگرچہ وہ مادے سے متعلق نہیں تھے ان کا تعلق افکار کے ارتقا سے تھا۔ مگر سائنسی تحققات نے ثابت کیا کہ مادے کے اندر متضاد قوتوں کی حرکت کا اصول جدلیاتی ہے۔ آیئے پہلے ہم ہیگل سے جدلیات کا اصول سمجھتے ہیں۔

ہیگل چونکہ تصوریت یا مثالیت پسند تھا لہٰذا اس کا حرکت و ارتقا کا نظریہ افکار تک رہا۔ وہ ایک وقت کے افکار، ایک وقت کی مروج قدروں کو اثبات (Thesis) کا نام دیتا ہے ان مروج افکار کے اندر ہی ان کی نفی یا ان کی ضد افکار موجود ہوتے ہیں جو ایک وقت گزرنے کے بعد اتنے طاقتور ہو جاتے ہیں کہ ابتدائی افکار کے مدمقابل آ جاتے ہیں۔ ان کو وہ (Anti thesis) کہتا ہے۔ پھر ان اضداد کے درمیان تصادم ہوتا ہے اور نتیجے میں مثبت اور منفی کا اتحاد

(synthesis) یا ترکیب عمل میں آتی ہے۔ یہ ترکیب مثبت اور منفی کی مخصوص خوبیوں کا مرکب ہوتی ہے، لیکن اپنے وقت کا اثبات بن جاتی ہے۔ اب اس مرکب اثبات کا آگے آنے والی قدروں اور افکار سے تصادم ہوتا ہے جو اس کی نفی میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ سلسلہ ارتقا جاری رہتا ہے۔

پھر ہیگل افکار سے فطرت کی طرف آتا ہے کہ فطرت میں ارتقا کا اصول بھی جدلیاتی ہے اس کی مثال وہ ایک پھول سے دیتا ہے اور اس میں جدلیات کے تین پہلو بیان کرتا ہے۔

ا۔ اثبات ۲۔ نفی ۳۔ نفی کی نفی یا اتحاد

وہ کہتا ہے کہ پھول میں نشو ونما کی قوت اثباتی ہے۔ لیکن یہی نشو ونما اسے بیج میں تبدیل کر دیتی ہے جو پھول کی نفی کر دیتا ہے۔ پھر اس بیج میں سے اکھوا پھوٹتا ہے جس سے بیج کی نفی ہو جاتی ہے۔ لیکن اکھوے میں پھول اور بیج دونوں کا جوہر محفوظ رہتا ہے۔ اس طرح نفی کی نفی یا اتحاد کی صورت میں مثبت اور منفی دونوں کی صلاحیتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ ہیگل نے جدلیات کے 6 اصول بیان کیے ہیں۔

ا۔ تضاد

۲۔ جدل و پیکار

۳۔ مثبت اور نفی اکا اتحاد

۴۔ کمیت کا کیفیت میں تبدیل ہونا

۵۔ نفی کی نفی

۶۔ قدروں کا تحفظ

سائنسی علم

زندگی میں بہت سی ایسی چیزوں سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے جن کے بارے میں ہم علم رکھتے ہیں اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کے بارے میں ہم عقیدہ رکھتے ہیں۔ علم ان چیزوں کے بارے میں رکھتے ہیں جو آپ کے مشاہدے میں آتی ہیں جیسے لکڑی پانی پر تیرتی ہے، چاند پر زمین کا سایہ پڑنے کو گرہن کہتے ہیں۔ اگر لکڑی کے تیرنے کا سبب دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ سائنسی علم ہے۔

کچھ ایسی چیزیں جو یا تو مادی وجود نہیں رکھتیں یا وہ مادی کائنات سے ماورا سمجھی جاتی ہیں جن کا آپ مشاہدہ نہیں کر سکتے ان کے بارے میں آپ عقیدہ رکھتے ہیں۔ جیسے مرنے کے بعد روح زندہ رہتی ہے یا آسمان کے آٹھ دروازے ہیں۔

مادیت اور تصوریت کے دونوں جڑواں فلسفوں کا الگ الگ مخصوص نظریہ علم بھی ہے۔ مادیت اپنے بطن میں الگ نظریہ علم رکھتی ہے جبکہ تصوریت کیعلمیات (Epistemology) الگ ہے ،تجسس پیدائشی طور پر انصاف کی فطرت میں شامل ہے۔ کیا، کیوں اور کیسے کا جواب جاننے کے لیے ہمیشہ سے دو طریقے اپنائے گئے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ قیاس کریں، سوچیں عقلی استدلال ترتیب دیں اور اس بنیاد پر جواب تخلیق کریں۔ کسی کامل یا مقدس ہستی کی طرف سے حاصل کی گئی معلومات کے دعوے پر عقیدہ رکھ کر اپنی رائے اس عقیدے کی روشنی میں قائم کریں۔ جبکہ تصوریت کے نزدیک مادہ ساکن ہے۔ اس میں حرکت و تغیر نہیں ہوتا اس لیے تصوریت پسندوں کے پاس ہمیشہ کیلئے تبدیل نہ ہونے والے مستقل اور دائمی نظریات ہوتے ہیں جنہیں وہ مطلق سچائی سمجھتے ہیں ایسے پتھر بنے نظریات کا مجموعہ عقائد کہلاتا ہے جو تجسس کو پیدا ہوتے ہی ختم

کر دیتا ہے۔اس نظریہ علم نے مذاہب، مابعدالطبیعات، ماورائیت کو جنم دیا ہے۔

دوسرا نظریہ علم مادئین کا ہے۔ مادئین کے نزدیک مادہ تغیر پذیر ہے ایک پراسیس ہے مادہ اور مادے کی حرکت دونوں قابل مشاہدہ ہیں۔ مادئین نے جاننے کا یہ طریقہ کار اپنایا کہ وہ مشاہدہ کریں۔ نتیجہ اخذ کریں۔ نتائج کی تصدیق کریں کہ کہ وہ درست ہیں یا نہیں۔ مادہ چونکہ ان کے سامنے ان کے لیے قابل مشاہدہ چیز تھی۔ اس پر وہ مختلف تجربے کر سکتے تھے تو انہیں تمام تر توانائیاں تسخیر مادہ ہی پر صرف کرنی پڑیں۔ اپنے تجسس سے اٹھنے والے سوالات کے جواب اپنے مشاہدے۔ تجربات، عقل وفہم سے خود ہی تلاش کرنے تھے۔ لہٰذا سائنس نے مادیت کی کوکھ سے جنم لیا۔

عظیم یونانی فلسفی ڈیموکرائٹس کا قول ہے کہیں پارس کا تاج حاصل کرنے کی بجائے اس بات کو ترجیح دوں گا کہ کسی مرض کا سبب دریافت کروں۔ صرف مرض ہی پر موقوف نہیں تمام کائناتی مظاہر کے ظہور پذیر ہونے کے اسباب کو اس کے مادی وجود میں تلاش کرنے کا سوچنے والوں ہی نے فلسفہ یا مادیت کی بنیاد رکھی تھی۔ تجربوں اور مشاہدوں کے ذریعے کائناتی مظاہر کے سببوں کی دریافت کا راسلوب اپنانے کا نام ہی سائنس نہیں بلکہ اس طریقہ کار سے حاصل ہونے والی معلومات کے ذخیرے کا نام بھی سائنس ہے۔

سائنس دنیا کو جاننے کے لیے مادئین کا ایک رویہ تھا۔ قدیم زمانے میں سائنس اگر چہ قابل شناخت شکل میں موجود نہیں تھی مگر علم کا یہ اسلوب مادیت یا فلسفے کے ساتھ ہی جنم لے چکا تھا۔ نیوٹن کے زمانے کے بعد تک سائنس نیچرل فلاسفی کے نام سے جانی جاتی تھی۔ علم اور سائنس اگرچہ دو الگ چیزوں کے نام نہیں مگر پاکستان کے مخصوص سیاسی حالات کی وجہ سے سائنسی علم نام کی ایک الگ اصطلاح متعارف کروائی گئی ہے تاکہ مذہبی علم کے نام پر عقائد کے مجموعے کو بھی علم کا درجہ دیا جا سکے۔

سائنسی علم کی خصوصیت یہ ہے کہ

(۱) مادے اور کائنات کے بارے میں جو نتائج جن تجربات سے اخذ کئے جاتے ہیں وہ ہر خاص و عام کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ کوئی بھی شخص، کسی بھی زمانے میں کسی بھی مقام پر انہیں دوہرا سکتا ہے۔ ان نتائج کو سائنسی حقائق سے عمومی قوانین اخذ کئے جاتے ہیں ان کی بنیاد پر کسی

دعوے کو قبول یا مسترد کیا جاتا ہے۔

(۲) تجربات کے بغیر محض خیال آرائی سے غلط نتیجے اخذ ہو سکتے ہیں۔ ایک سادہ سا سوال کہ بلندی سے ایک کلو وزن کا پتھر پہلے گرتا ہے یا کاغذ کا ٹکڑا؟ یونانی فلسفی ارسطو اور اس کے بعد کے لوگوں نے بغیر تجرباتی شہادتوں کے اس کا غلط جواب دیا کہ پتھر پہلے گرتا ہے۔ لیکن گیلیلیو نے تجربات سے ثابت کیا کہ خلا میں جہاں ہوا کی یا کوئی دوسری مزاحمت نہ ہو دونوں ایک رفتار سے گرتے ہیں۔

(۳) ان تجربات سے جو عمومی قوانین اخذ کیے جاتے ہیں انہیں ریاضیاتی کلیہ یا فارمولا کی شکل میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ جو سائنسدانوں کو مادے کے بارے میں پیشن گوئی کا اہل بناتا ہے۔ خاص حالات میں کسی عمل یا مظہر کا کیا نتیجہ ہوگا؟ تجربات کے دوران اور آئندہ کیا پیش آنے والا ہے۔

(۴) مادیت اور سائنس نے انسانیت کو کیا دیا؟ اب تو انسانی زندگی سائنسی ایجادات کے استعمال کے بغیر ممکن ہی نہیں رہی۔ زندگی کے ہر شعبے میں مواصلات ہوں یا ٹرانسپورٹ۔ تعلیم ہو یا علاج، موسموں کا مقابلہ کرنا ہو یا اندھیروں میں روشنی ہر چیز اب سائنسی ایجادات کے استعمال کی مرہون منت ہے۔ سائنس نے انسان کو فطرت پر کنٹرول دیا۔ فطرت پر قادر بنایا۔ جب انسان سبب دریافت کر کے ان کو اپنے استعمال میں لے آئے ان کا استعمال میں آنا ہی سبب کے صحیح ہونے کی تجربی تصدیق ہے، 5روپے کا سکہ اگر آسمان کی طرف اچھالو تو وہ زمین پر آ گرتا ہے۔ مگر ہوائی جہاز ہزاروں مسافروں اور ان کے ٹنوں وزنی سامان کو لے کر ہوا میں ساری دنیا گھومتا ہے۔ 5روپے کا سکہ سمندر میں پھینکو تو ڈوب جاتا ہے۔ مگر جدید بحری جہازوں پر ایسے شہر آباد ہوتے ہیں جن میں ہوائی اڈے قائم کیے گئے ہیں دوربین انسانی آنکھ سے لاکھوں میل دور تک دیکھ سکتی ہے۔ الیکٹرانک مائیکروسکوپ ایک چھوٹے سے ذرے کو لاکھ گنا بڑا کر کے دکھاتی ہے۔

مادیت نے سائنس کو جنم دیا تھا۔ سائنسی ترقی کی اس منزل پر سائنس نے ایک نئی مادیت کو جنم دیا جسے جدلی مادیت کہتے ہیں۔ یوں کہیے کہ جدلی مادیت سائنسوں کی حاصلات کی تعمیم ہے۔ کائنات کے وجود، حرکت وارتقا کے قوانین، زندگی، ترقی کی منزلیں طے کرتے سماج اور متصادم افکار کے دریافت شدہ سببوں کو عمومی قوانین کو سمجھنے اور ان قوانین کے ذریعے انہیں تبدیل کرنے کا زمینی فلسفہ ہے۔

جدلی مادیت کے قوانین

19 ویں صدی تک کی دریافتوں کو کارل مارکس نے ایک مربوط نظام فکر کی شکل میں پیش کیا اس نظام فکر کو جدلی مادیت کہتے ہیں۔ جدلی مادیت ایک سائنسی علم ہے، چونکہ یہ مادے سماج اور افکار کی حرکت یا ارتقا کے عمومی قوانین سے اخذ کیا گیا ہے اس لیے یہ ہر سائنسی دریافت کی طرح مادے، سماج اور افکار کی تبدیلی پر انسان کی دسترس کو بڑھاتا ہے، لینن کے بقول مارکس نے فلسفیانہ مادیت کو گہرائی اور نشو ونما بخشتے ہوئے اسے مکمل کیا اور فطرت کے متعلق اس کے علم کو انسانی معاشرے کے علم تک پھیلا دیا۔

جدلی مادیت کے قوانین مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ مادہ جامد و ساکن نہیں۔ مادہ اور اس سے پیدا ہونے والی ہر شے ہر لحظہ تغیر پذیر ہے، اینگلس کے مطابق "مادے کا حرکت کے بغیر تصور کرنا اتنا ہی محال ہے جتنا کہ حرکت کا مادے کے بغیر تصور کرنا۔"

کوئی شے حتمی، آخری، قطعی اور مطلق نہیں، تغیر ہر چیز کی بناوٹ یا ساخت کا بنیادی عنصر ہے۔ ہر چیز ہمہ وقت حرکت و تغیر میں ہے خواہ وہ مادہ ہو، انسانی معاشرہ یا افکار۔

2۔ کائنات میں اشیاء ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہیں۔ پورا نظام کائنات مربوط ہے ہر ایک چیز دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہے اور دوسری چیزوں کا اثر لیتی ہے۔ اندرونی ساخت اور ماحول کا آپسی تال میل ارتقا کا سبب بنتا ہے۔

3۔ مادے کے بطن میں متضاد قوتیں موجود ہیں۔ جن کا ٹکراؤ اور تصادم مادے کو حرکت میں رکھتا ہے۔ حرکت مادے کے وجود کا طریقہ ہے۔

4۔ ہر اثبات میں اس کی نفی ہوتی ہے۔ اثبات اور نفی کے تصادم سے نفی کی نفی ہو جاتی ہے جو ایک طرح سے مثبت اور منفی کی بقا کی صلاحیت رکھنے والی قدروں کا مرکب ہوتا ہے۔ جو خود ایک اثبات بن جاتا ہے۔

کلاسیکی یونانی مادئین

فلسفے کا کوئی نظام خواہ کیسا ہی آزاد اور کتنا ہی الگ تھلگ معلوم ہو لیکن وہ حقیقت میں ایک وسیع تر تاریخی سلسلے ہی کی ایک کڑی ہوتا ہے اور اس ربط کے ساتھ ہی قابل فہم ہوتا ہے۔ فلسفہ مادیت کی اصطلاح تاریخ فلسفہ میں سب سے پہلے رابرٹ بوئیل نے 1674 میں وضع کی لیکن مادیت کا انداز نظر علی عباس جلالپوری کے بقول اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود فلسفہ۔ آج کی سائنسی مادیت بھی دراصل کلاسیکی مادئین کی بنیادوں پر کھڑی سائنسی دریافتوں کی ایک عمارت ہے۔

مادیت ایک ایسا علم ہے، جس کی ابتدا یونان میں ہوئی۔ اگرچہ اکا دکا لوگ باقی دنیا میں بھی موجود تھے مگر ایک روایات قائم نہ کر سکے۔ مشرقی اقوام میں چونکہ علم پر مذہب پیشہ لوگوں کا اجارہ رہا اس لیے ان کا علم بقائے روح کے عقیدے سے آگے نہیں بڑھا۔ کائنات کے وجود میں آنے، مادے میں حرکت و تبدیلی، مظاہر فطرت، انسانی سماج اور اخلاق سب کی تشریح کائنات سے باہر کسی خیالی بیرونی عامل کے اس پر اثر انداز ہو جانے سے کی جاتی رہی جس کے نتیجے میں وہ اشیا کی فطری توجیہہ کی کوشش کے بغیر ہی مطمئن ہو جاتے رہے۔ اس طرح مذہبی معاشروں میں فلسفہ اور سائنس پنپ نہیں سکے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فلسفہ اس وقت شروع ہوا جب انسان کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ مظاہر کی توجیہہ فطری اسباب سے کرے اور مادی کائنات کی حقیقت کو اس کی ساخت کے ذریعے جانے۔ آج کی جدید مادیت جس طرح ایک مربوط نظام فکر کے طور پر تشکیل پا چکی ہے یہ تین اجزائے ترکیبی کا مجموعہ ہے۔ یونانی مادئین اگرچہ انہیں الگ الگ اور آزاد موضوعات کے طور پر زیر بحث لائے اور بعض اوقات متضاد خیالات کا شکار بھی ہوئے لیکن بنیادیں بہر حال یونانیوں

ہی نے رکھیں۔ مادیت کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں۔

1۔ صرف مادے ہی کو حقیقت، ہستی اور وجود جاننا۔ یہ ماننا کہ اس کے علاوہ کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ مادے ہی کی پیداوار ہے۔ یہاں تک کہ انسانی فکر، خیالات اور تصورات کی اصل بھی مادہ ہے۔

2۔ یہ جاننا کہ مادہ وہ وجود ہے جس کی حرکت کا ماخذ اس کے اندر ہی ہے ہم اس کو ایسے سمجھتے ہیں کہ تغیر یا حرکت کے لیے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ حرکت دینے والی قوت جس کو آپ عنصر محرک کہہ لیں اور وہ چیز جس کو حرکت دی جائے مطلب عنصر متحرک مادہ وہ عنصر متحرک ہے جس کا عنصر محرک اس کے اپنے ہی وجود میں موجود ہے۔

3۔ حواس انسانی علم کا واحد ذریعہ ہیں۔ انسانی مشاہدے یا تجربے کے ماورا صداقت یا حقیت کا کوئی وجود نہیں۔ حسیات کے وسیلے سے حاصل کیے گئے علم کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ صرف اور صرف قیاس آرائی ہے خواہ آپ اس کو وجدان جیسے مبہم لفظ کا لباس پہنا دیں۔ وجدان کے ذریعے جاننے کا دعویٰ کرنے والا شخص بھی یہ نہیں جانتا کہ وہ کیسے جانتا ہے۔ وجدان بھی ایک قیاس ہی ہوتا ہے جو محض ہماری اس لاعلمی کی پردہ پوشی کرتا ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ ہم کیسے جانتے ہیں۔ لیکن سعید ابراہیم کہتے ہیں کہ عقل اور وجدان دماغ کی صلاحیتیں ہیں جب ذہن کسی مسئلے میں جنون کی حد تک انوالو ہو جاتا ہے تو وہ سوتے جاگتے اس کے بارے میں یوں سوچتا رہتا ہے کہ خود فرد کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا، پھر یوں ہوتا ہے کہ ایک دم کوئی جواب سامنے آ کر ہمیں حیران کر دیتا ہے۔ یاد رکھیئے کہ حقیقی وجدان صرف غور و فکر کرنے والوں کو ہی ہوتا ہے اور وہ بھی ان کے مخصوص میدان میں نہ کہ دلچسپی سے غیر متعلق معاملات میں۔

یونانی فلسفیوں کے وہ افکار جن سے مادیت کا یونانی فلسفہ ماخوذ ہے ایک معدن کی طرح ہیں جس سے کچ دھات برآمد ہوتی ہے۔ اس کچ دھات سے لوثیں (Impurity) ختم کر کے اس کو خالص دھات میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اس طرح یونانی کلاسیکی مادیت بھی مختلف طویل تحریروں میں پھیلی ہوتی ہے لیکن یہاں وہ افکار نقل کیے جا رہے ہیں جن سے فلسفہ اخذ کیا گیا ہے۔

اساطیری خداؤں اور اصنام پرستی نے انسانی فکر کو اس بری طرح اپنے پنجے میں جکڑ رکھا تھا کو دنیا میں ہونے والے ہر وقوعہ کو لوگ دیوتاؤں اور دیویوں کی طرف منسوب کیا کرتے تھے۔

مسائل فطرت پر آزادانہ غور وفکر کے دوران سوال پیدا ہوا کہ کائنات کو بعل مردوخ اور آمن رع جیسے دیوتاؤں نے نہیں بنایا تو آخر یہ دنیا کیسے وجود میں آگئی؟ اس کی اصل کیا ہے؟ اشیاء کس جوہر سے بنی ہیں؟

ایسی سوچ کا آغاز ملطس کے فلسفیوں نے کیا۔ ارسطو نے اپنی کتاب مابعد الطبیعات میں تھیلز کے نظریے کو اس طرح پیش کیا ہے کہ "ملطس کے تھیلز نے یہ تعلیم دی کہ تمام اشیاء پانی ہیں" آئیونیا کے دیگر فلسفیوں کی ساری توجہ کائنات کے اساسی عنصر پر تھی۔

یونانی ذہن کے ارتقا کی اگلی منزل انیکسنڈر ہے۔ تھیلز نے پانی سے تکوین کائنات کے عمل کی تشریح نہیں کی تھی۔ پانی سے تمام اشیا کس طرح وجود میں آتی ہیں اس کا جواب تھیلز نے نہیں دیا تھا۔ اس کی وضاحت انیکسمینڈر نے یوں کی۔ وہ کہتا ہے کہ زمین پہلے پانی تھی۔ عمل تبخیر سے خشک ہوتی چلی گئی۔ گرم مرطوب آب وہوا میں کیچڑ سے زندگی کا ظہور ہوا۔ پہلے نچلے درجے کی مخلوقات پیدا ہوئیں پھر ان سے بتدریج اعلیٰ مخلوقات کا ارتقا ہوا۔ انسان شروع شروع میں مچھلی تھا۔ پانی کی کچھ مخلوق سمندروں سے ہجرت کر کے خشکی پر آگئی اور ماحول سے مطابقت اختیار کر لی۔ اس کے نزدیک کائنات کی تخلیق غیر معین، غیر ممیز مادہ سے ہوئی۔ مادہ کی قسموں میں فرق اس کی صفات کی وجہ سے ہے۔ مٹی کی صفات دھات کی صفات سے الگ ہیں دھات کی صفات ہوا اور پانی کی صفات سے مختلف ہیں۔ اشیاء کا اختلاف دراصل صفات کا اختلاف ہے ورنہ کائنات کی تہہ میں جس قسم کا مادہ پایا جاتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا فرق و امتیاز نہیں ہے۔ یہ مادہ خلا میں لامحدود طور پر پھیلا ہوا ہے۔

بات یہیں پر رک نہیں گئی۔ آئیونیا ہی کے ایک اور فلسفی انیکسمینز نے کائنات کی اصل ہوا کو قرار دیا۔ اشیا جس بنیادی عنصر سے وجود میں آتی ہیں وہ ہوا ہے۔ درخت، پتھر، چاند، سورج اور ستارے دراصل ہوا ہی کے مختلف روپ ہیں۔ زمین ہوا کی طشتری پر تیر رہی ہے۔ ہوا کی خصوصیت حرکت ہے۔ ہوا میں دو طرح کے متضاد عمل جاری ہیں ایک جلنے کا عمل اور ایک ٹھوس بننے کا عمل تکثیف (Condensation)۔ ہوا گاڑھی ہو کر پانی بنتی ہے۔ پھر بادل اور پھر زمین اور آخر کار سخت ہو کر پتھر میں تبدیل ہو جاتی ہے چیزوں کے مختلف النوع ہونے کا انحصار ہوا کی کم یا زیادہ مقدار ہے۔ انیکسمینز کے نزدیک صفات کا مختلف ہونا دراصل ہوا کی مقدار کا اختلاف ہے۔ یعنی

کیفیت دراصل کمیت پر منحصر ہے۔

آئیونیا کے یہ فلسفی جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں ان کی ساری توجہ کائنات کے اساسی اصول کی ماہیت اور اس کے اساسی اصول کو جاننے پر مرکوز تھی۔ جبکہ یونان ہی کے ایک دوسرے علاقے ایلیا کے فلسفیوں نے اس اساسی اصول کو واحد جانا اور اس واحد کو وجود کا نام دیا جو مختلف ترجموں میں ہستی اور مادی وجود بھی کہلاتا ہے۔

ایلیا کے فلسفی پارمینائڈز نے کہا کہ "ہستی کا نیستی سے ظہور نہیں ہو سکتا۔ کوئی چیز عدم سے وجود میں نہیں آسکتی۔ ہستی ازلی اور ابدی ہے۔ اس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ کوئی انجام۔ اگر ہستی کا کوئی آغاز ہو تو ظاہر ہے کہ یہ یا تو نیستی سے ہوا ہوگا یا ہستی سے یعنی ہستی یا تو عدم سے وجود میں آئی ہوگی یا وجود ہی سے اس کا ظہور ہوا۔ پہلی صورت عقلاً محال ہے کیونکہ عدم محض سے وجود میں آنا ناممکن ہے۔ دوسری صورت میں بھی ہم آغاز کا تصور نہیں کر سکتے، کیونکہ ہستی سے ہستی میں آنا کسی قسم کی شروعات کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ ہستی سے پہلے بھی ہستی تھی جس سے کہ یہ وجود میں آتی ہے تو یہ کہنا دراصل یہ کہنے کے مترادف ہے کہ ہستی ہمیشہ سے تھی!

پارمینائڈز کا یہ نظریہ مادیت میں مادے کے ازلی ہونے اور قائم بالذات ہونے کے تصور کی بنیاد بنا تاریخ فلسفہ میں پہلی بار پارمینائڈز نے عقل (Reason) اور حواس (Senses) کی تصدیق کا نظریہ پیش کیا۔ حقیقت یا ہستی کا علم صرف عقل کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ حواس ہمیں دھوکا دیتے ہیں۔ دنیا کی وہ تصویر جس کے خطوط حواس کھینچتے ہیں غلط تصویر ہے۔ پارمینائڈز کے نزدیک صداقت صرف عقل میں ہے۔ منطقی استدلال میں ہے۔ اگر آپ دلائل سے کسی چیز کا وجود ثابت کر دیں خواہ حقیقت میں آپ کے حواس نے اس کا مشاہدہ نہ بھی کیا ہو تو اس نظریہ کے مطابق وہ چیز ہے۔ اس کا وجود چونکہ استدلال سے ثابت ہے اس لیے وہ ہے یہ نظریہ بعد میں تصوریت یا مثالیت پسندوں کا غالب خیال بن گیا کہ "صداقت عقلی استدلال میں ہے حواس میں نہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ پارمینڈز نے اپنے نظریہ میں پائے جانے والے تضاد سے بے خبر تھا۔ وہ فکر انسانی کی ایک ایسی غیر ترقی یافتہ سٹیج پر تھا کہ جہاں اسے اپنے نظام فکر کے ان دو پہلوؤں میں تضاد کا احساس نہیں ہو سکا۔

تھیلز سے پارمینائیڈز تک تمام فلسفیوں کی کوشش یہ رہی ہے کہ مظاہر کے پیچھے کارفرما اصلیت کو معلوم کیا جا سکے، پانی، ہوا، غیر متعین مادہ اور ہستی کے نظریات اسی کوشش کے نتیجے میں قائم کیے گئے۔ حقیقت اب تک کے فلسفیوں کے نزدیک غیر متغیر، جامد و ساکن، ازلی و ابدی اصلیت تھی۔ موجودات کے متعدد ایسے شواہد جو متغیر اور حرکت پذیر تھے وہ ان فلسفیوں کا موضوع نہ بن سکے۔

ہیراقلیتوس نے اس کے برعکس ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ وہ حرکت و تغیر کو کائنات کی بنیادی خصوصیت تصور کرتا ہے۔ ہر شے جو موجود ہے متغیر ہے اور متحرک ہے۔ استقلال، دوام اور سکون فریب نظر ہے۔ جو کچھ ہے مسلسل بدل رہا ہے۔ جو کچھ اب ہے کسی وقت میں نہیں تھا وجود میں آتا ہے، پروان چڑھتا ہے اور معدوم ہو جاتا ہے، کائنات سیل بے پناہ میں مسلسل بہہ رہی ہے۔ سکون وثبات کی جو عارضی صورتیں ہمیں نظر آتی ہیں وہ باطل ہیں۔ ہیراقلیتوس کے نزدیک ایک لمحے کے لیے بھی کسی شے کا ساکن رہنا محال ہے۔ نہ صرف اشیاء لحہ بہ لحہ بدلتی ہیں بلکہ ایک ہی لمحے میں وہ بظاہر ساکن بھی ہوتی ہیں لیکن بدل بھی رہی ہوتی ہیں۔

اس وقت کے تمام فلسفیوں کے خیالات کو ایمپیڈوکلیز نے مربوط کیا۔ اس نے کوئی نیا نظریہ دینے کی بجائے اپنے دور کے مختلف اور متضاد فکری رجحانوں کو ایک نظام فکر میں سمو دیا۔ قبل اس کے پارمینائیڈز ہستی یا وجود کو ازلی و ابدی اور غیر متحرک قرار دے کر مادے کو ساکن و جامد اور غیر متبدل مان چکا تھا۔ وہ اس لیے عناصر ترکیبی کے اندر حرکت و تغیر کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ ایسا کرنے سے مادہ ازلی، ہمیشہ سے ایک ہی حالت پر قائم نہیں رہتا تھا جس کے نتیجے میں اسے ماننا پڑتا تھا کہ کچھ چیزیں نہیں تھیں، کسی وقت وجود میں آئیں اور پھر تبدیل ہو کر نئی حالت پر آگئیں یا ختم ہو گئیں۔

ایمپیڈوکلیز کے نزدیک یہ مسئلہ زیر غور تھا کہ کائنات کے یہ بنیادی چار عناصر پانی، مٹی، آگ اور ہوا اگر جامد وں ساکن ہیں تو ان کا امتزاج کیسے ہوتا ہے۔ پھر یہ آپس میں مل کر نئی نئی چیزوں کو کیسے تخلیق کرتے ہیں۔ اگر میز، گلاس اور انسان دراصل پانی، مٹی آگ اور ہوا کے مختلف تنا سبات کے لحاظ سے مرکبات ہیں تو یہ ترکیب، یہ امتزاج کس طرح وقوع پذیر ہوا؟ چاروں عناصر اگر جامد و ساکن ہیں تو پانی اور مٹی کس طرح گھل مل گئے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ایمپیڈوکلیز نہایت شاعرانہ انداز میں حرکت و تغیر کا ایک نئے روپ میں تعارف کرواتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ کائنات ان چار عناصر کا ایک کرہ ہے۔ اس کرہ میں چاروں عناصر مستقل

حصوں میں منقسم ہیں۔ ایک حصہ میں تمام کی تمام مٹی، دوسرے میں تمام کی تمام آگ، تیسرے میں تمام پانی اور چوتھے میں ہوا ہے۔ شروع شروع میں نہ آتش کا پانی میں نہ ہوا کا آتش یا مٹی میں عمل دخل تھا۔ اس کائناتی کرہ کے باہر چاروں طرف حرکت و تغیر کے دو متضاد عمل جاری ہیں۔ ایک عمل نفرت کا ہے دوسرا محبت کا۔ محبت کا عمل اس کرہ کے مرکز کی طرف کھینچتا ہے۔ جب کہ نفرت کا عمل مرکز سے پرے ہٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ محبت اور نفرت عناصر کے ملاپ اور علیحدگی کا باعث ہے اس عمل سے الگ الگ چیزیں وجود میں آتی رہتی ہیں اور معدوم ہوتی رہتی ہیں۔

مادیت کی روایت جس کا آغاز تھیلز سے ہوا تھا جس میں فلسفیوں نے مردانہ وار عالم کی کنہ کو دیوتاؤں کی بجائے مادی حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کی۔ اس روایت کا آخری فرد ڈیموکرائٹس تھا۔ تکوین کائنات کے بارے میں اس نے کہا کہ کائنات سراسر مادی ہے۔ اس کے خیال میں حقیقتیں دو ہیں، ایٹم اور خلائے مکانی۔

ڈیموکرائٹس کے خیال میں کائنات کی موجودات کو اگر مسلسل چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرتے چلے جائیں تو آخر ہم ایسے ٹکڑوں پر پہنچیں گے کہ جنہیں مزید تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ان مزید ناقابل تقسیم ٹکڑوں کو سالمات، ذرات، جواہر یا ایٹم کہتے ہیں، ڈیموکرائٹس کے نزدیک ایٹموں کی حرکت اندرونی طور پر ہے وہ ایٹموں کی مثال ان خاکی ذرات سے دیتا ہے جو ایک بند کمرے میں داخل ہونے والی شعاع میں متحرک نظر آتے ہیں۔ لیکن ان ذرات کی حرکت سے وہ یہ نتیجہ بھی اخذ کرتا ہے ایٹم بے وزن ہوتے ہیں اور وہ خلا میں تیرتے پھرتے ہیں۔

انسانی جسم بھی ڈیموکرائٹس کے نزدیک ایٹموں کے مجموعے کا نام ہے اور روح بھی لطیف ایٹموں سے بنی ہے۔ روح کے ایٹم گول اور انتہائی لطیف ہوتے ہیں۔ وہ حسی ادراک کے بارے میں بھی ایک نظریہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب لاتعداد ایٹم اکٹھے ہوتے ہیں تو کوئی چیز وجود میں آتی ہے۔ اس چیز کی خصوصیات ان ایٹموں کی شکل وصورت اور حجم پر مبنی و منحصر ہے۔ بہت سے گول اور لطیف ایٹم اکٹھے ہو کر اعضائے حس (Sense Organ) کی تخلیق کرتے ہیں۔ خارج سے کسی شے کا ادراک اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ شے لطیف ایٹموں کی صورت میں اپنا ہیولا بناتی ہے۔ یہ ہیولا سیلان کی صورت میں تیرتا ہوا اعضائے حس میں داخل ہو کر اس شے کا تاثر ذہن تک پہنچاتا ہے۔ جس سے اس شے کا امیج بنتا ہے جو ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔ ذائقہ، رنگ اور

آواز کی خصوصیات ایٹموں میں نہیں پائی جاتی بلکہ یہ ایٹموں کے اعضائے حس پر اثر انداز ہونے کا عمل ہے۔

ڈیموکرائٹس دیوتاؤں پر بھی یقین رکھتا تھا۔ مگر اس کے نزدیک دیوتا بھی ایٹموں کے جمع ہونے سے وجود میں آگئے تھے جس طرح دیگر انسان اور حیوان۔ لیکن وہ انسان اور حیوانوں سے بہت بڑے ہیں اور طاقتور بھی۔ لیکن ان کا حشر بھی وہی ہوگا جو انسان اور ذی روح افراد کا ہوتا ہے، انسان کو ان کا ادب و احترام ضرور کرنا چاہیے۔ مگر ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں وہ بھی مادی کائنات اور انسان کی طرح ذراتی مادیت کے میکانکی اٹل قوانین میں جکڑے ہوئے ہیں۔

یونانی فلسفے کا اہم موڑ

انیکسا گوراس یونانی فلسفے میں ایک کڑی کے طور پر بہت اہم ہے۔ اس کے فلسفے کے دو رخ ہیں۔ پہلا رخ کائنات کی مادی تشکیل کے یونانی فلسفیانہ رجحان کا تسلسل ہے۔ یہ مادے اور اس کی ہیئت سے متعلق ہے اس کا کہنا تھا کہ سورج ایک بہت بڑا آتشیں پتھر ہے اور چاند کی تخلیق زمین کی مٹی سے ہوئی ہے۔ یہ نظریات یونانیوں کے لیے ناقابل برداشت تھے کیونکہ وہ سورج اور چاند کو دیوتا مانتے تھے۔ ان نظریات کی وجہ سے انیکسا گوراس کو قید کر دیا گیا۔ اس پر مقدمہ چلا اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا جہاں سے وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

انیکسا گورراس کے فلسفے کا دوسرا رخ اس کا نظریہ ناؤس (Nous) ہے۔ ناؤس کو آپ کائناتی ذہن کہہ سکتے ہیں۔ کائناتی ذہن کا نظریہ متعارف کروا کے انیکسا گوراس نے کائنات کو کسی منصوبہ بندی کے تحت کی گئی تخلیق ثابت کیا۔

وہ کہتا ہے کہ دنیاؤں کی تشکیل ایک عالمگیر حرکت سے ہوئی۔ یہ حرکت عقل، ذہن یا ناؤس نے پیدا کی۔ ناؤس نے مادہ کے ابتدائی لامحدود آمیزہ میں حرکت پیدا کی یہ تحریک ایک گردش کی صورت میں وسط میں پیدا ہوئی۔ یہ گردش دوری سمندر میں پیدا ہونے والے گرداب کی طرح تھی اس نے خاکی ذرات کو یکجا کر کے اجرام سماوی کی صورت میں خلا میں بکھیر دیا اور ہوا ہلکی ہونے کی وجہ سے اوپر اٹھ گئی۔ ناؤس تمام تر حرکت کی علت ہے جبکہ بذات خود غیر متحرک ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ زمین کے اندر ایسی قوت پائی جاتی ہے جو اشیا کی صفات و تغیر کا باعث ہے اس کے علاوہ کائنات کا نظام و نسق، چاند اور سورج کا طلوع و غروب اور دیگر منظم قوانین اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ کائنات کی تشکیل میں عقل اور ذہن کا بہت عمل دخل ہے۔ ہماری کائنات میں اندھی

میکانکی قوتوں کا راج ہے۔ چاند ستاروں سورج وغیرہ میں افراتفری نہیں پائی جاتی جس سے ہمیں کائنات کی تشکیل وتعمیر میں ایک عالمگیر حکمت اور ذہن کا سراغ ملتا ہے۔ اس عالمگیر حکمت یا کائناتی ذہن کا نام ناؤس ہے، کائناتی تشکیل کا نظم ونسق اور ہم آہنگی ناؤس کی وجہ سے ہے۔

انیکسا گوراس نے کائناتی ذہن کا مفروضہ دو وجوہات کی بنا پر پیش کیا۔ اس زمانے کی روز مرہ زندگی میں وہ دیکھتا تھا کہ کوئی ساکن شے اس وقت حرکت میں آتی ہے جب کوئی بیرونی عامل اس کو حرکت دے۔ اپنی روزمرہ زندگی کے اس تجربے کا اطلاق اس نے کائنات پر کیا۔ کائنات کی طبعی تشریح کے لیے حرکت کے اصول کے طور پر ناؤس کو بطور متحرک متعارف کروادیا دوسری وجہ وہ ایک ایسے معاشرے میں رہتا تھا جس میں کارفرما قوانین کو کسی دانا کے ذہن کی تخلیق سمجھا جاتا تھا۔ جن قوانین کو معاشرے میں نظم ونسق قائم کرنے کے لیے لاگو کیا گیا سمجھا جاتا تھا۔ انیکسا گوراس نے کائناتی نظم ونسق کے لیے جاری وساری قوانین کو بھی اپنے معاشرے پر لاگو قوانین کے عکس کے طور پر دیکھا۔ جس کی وجہ سے اس نے کائناتی نظم ونسق قائم کرنے کے لیے قانون بنانے والے کائناتی ذہن یا ناؤس کا نظریہ پیش کیا۔

انسان کو بھی اس نے ایک بڑی کائنات کے چھوٹے سے نمونے کے طور پر پیش کیا۔ وہ کہتا ہے کہ ناؤس کا کچھ حصہ انسانی جسموں میں ضرور ہے یہی وجہ ہے کہ وہ جسم زندہ اور ذہین ہیں۔ کائناتی ذہن کے نظریہ میں بہت سے ایسے تعلقات پوشیدہ تھے جو وقتاً فوقتاً بعد میں آنے والے فلسفیوں کے تصورات میں منعکس ہوتے رہے۔ جن میں سب سے اہم غائیت (Teleolgy) اور وہبی تصورات (Innate ideas) ہیں۔

عالم چونکہ عقل کی پیداوار ہے اس لیے وہ کسی مقصد کے لیے بنایا گیا ہے۔ انسان جو کچھ بھی تخلیق کرتا ہے وہ کسی نہ کسی مقصد کے حصول یا کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایسا کرتا ہے۔ انسان جو کچھ بھی بناتا ہے اس کی کوئی غرض وغایت ضرور ہوتی ہے۔ وہ فلسفی جو کائنات کو تخلیق سمجھتا ہے یا کوئی فلسفی جو مادے کو ازلی سمجھنے کے باوجود اس کو حرکت دینے والے بیرونی عامل کا تصور رکھتا ہے اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرنا لازمی ہے کہ کائنات کی غرض وغایت کیا ہے۔ یہ کس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے۔ ارسطو نے غایت کے فلسفے کو عروج تک پہنچایا میکانکیت کا دارومدار قانون علت پر ہے اسے (Causation) کہتے ہیں۔ یہ دنیا کے واقعات اور مظاہر کے اسباب

دریافت کرنا ہوتا ہے۔ قانون علیت توجیہہ فراہم کرتا ہے جبکہ غائیت کسی چیز کی توضیح فراہم کرتا ہے۔

وہبی نظریات بھی کائناتی ذہن کا ایک عکس ہے۔ یہ نظریہ کہ انسانی ذہن کے اندر کچھ ایسے تصورات ہوتے ہیں جو تجربہ سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ پیدائشی طور پر انسانی عقل کے اندر ودیعت کئے گئے ہوتے ہیں جیسے خدا کا تصور، اخلاقیات وغیرہ۔

خدا کا تصور انسان کے اپنے خالق ہونے کا انعکاسی تصور ہے۔ آپ اپنے اردگرد نظر دوڑائیں فطرت کی تخلیق کردہ چیزوں کے مقابلے میں انسان کی تخلیق کی ہوئی چیزیں آپ کو گنتی میں زیادہ نظر آتی ہیں۔ انسان کا اپنے خالق ہونے کا تجربہ اور تصور، پتھر کے اوزار بنانے کے زمانے سے اس کے ذہن میں ایک بدیہی حقیقت کے طور پر موجود ہے، جو کہ وہبی نہیں بلکہ حسی ہے۔ انسان چونکہ خود خالق ہے یہ بات اس کے ذہن میں اس طرح منعکس ہوتی ہے کہ میرا اور اس کائنات کا بھی کوئی خالق ضرور ہے۔

یونانی فلسفے میں اخلاقیات کی ابتدا سقراط نے کی۔ وہ انسانوں کے ان فرائض کو جو دیوتاؤں سے تعلق رکھتے تھے اہم ترین خیال کرتا تھا۔ وہ اپنی اخلاقیات کو اس سہارے کو نہیں چھوڑ سکتا تھا وہ اخلاقی لحاظ سے اعمال اور ان کے نتائج کے درمیان فطری لزوم کو ثابت نہیں کرسکتا تھا۔ اس وجہ سے وہ اخلاقی قوانین کو دیوتاؤں کا نوشتہ قرار دیتا تھا۔ اخلاقیات کو انسانی فطرت سے جوڑنا ایک طرح سے ناؤس کے اثر کا نتیجہ تھا جس کے لیے اسے نظریہ فطرت کے ساتھ دینیات کو پیش کرنا پڑا۔ جس کو بعد ازاں مذاہب نے اپنایا اور فکر کی تاریخ پر اس کا اثر باقی ہے۔ آج دنیا کے تمام تر مذاہب کا عقیدہ ہے کہ معقول کردار عقیدے کے بغیر ناممکن ہے۔ حالانکہ اخلاقیات بھی ثاقب رزمی کے بقول۔

"اخلاقیات وہ تجربی نتائج ہیں جو صدیوں کے دوران انسانوں کے درمیان معاشرتی تعلقات کے تواتر سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس لیے وہ ایک تاریخی پیداوار ہیں۔ انسانی معاشرے کے معاشی اور معاشرتی نظام سے متعین ہوتے ہیں نہ کہ انسان کے باطنی یا مجرد تصورات سے یہ عملی معاشرتی رشتوں کے بطن سے پھوٹتے ہیں کیونکہ انسان کی زندگی ایک تجریدی مظہر نہیں ایک مادی مظہر ہے"۔

(سائنسی فکر اور ہم عصر زندگی۔ ثاقب رزمی)

مادی کائنات کے حرکت دینے والے غیر متغیر ناؤس کو افلاطون امثال یا تصورات کی شکل

میں دیکھتا ہے لیکن یہ بتانے سے قاصر ہے کہ غیر متغیر تصورات کس طرح تغیر و حرکت کی علت ہو سکتے ہیں۔

رواجی تصوریت

مثالیت، عینیت یا تصوریت کے فلسفیانہ پہلو کو سمجھنے سے پہلے ہم اپنی روزمرہ زندگی میں رائج تصوریت کا جائزہ لے لیں، آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے مادی فلسفے کو سمجھنے کا آغاز تین مثالوں سے کیا تھا۔ اب تصوریت کو سمجھنے کے لیے بھی ہم انہی تین مثالوں کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھتے ہیں۔

1۔ پہلی مثال یہ کہ آپ موٹر سائیکل پر کہیں جا رہے ہیں کہ راستے میں آپ کی موٹر سائیکل اچانک بند ہو جاتی ہے، آپ موٹر سائیکل کو سڑک کے ایک کنارے پر لے جاتے ہیں۔ اس کی ٹینکی میں پٹرول چیک کرتے ہیں اگر پٹرول ہے تو پھر اس کا پلگ اتار کر دیکھتے ہیں۔ وہ بھی ٹھیک ہے تو آپ موٹر سائیکل کے بند ہونے کی کسی اور وجہ کو بھی موٹر سائیکل کی ساخت ہی میں تلاش کرتے ہیں۔ آپ کا یہ رویہ مادی یا سائنسی رویہ کہلاتا ہے۔

اب جب آپ موٹر سائیکل لے کر واپس گھر پہنچے ہیں تو آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ موٹر سائیکل لے کر گھر سے باہر نکل رہے تھے تو آپ کی والدہ نے آپ کو باہر جانے سے منع کیا تھا۔ مگر آپ نے ایک نہ سنی اور چل دیئے۔ آپ نے والدہ کی نافرمانی کی اب گھر لوٹنے پر گھر والوں نے آپ سے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو آپ نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ جس پر آپ کے گھر والوں نے آپ کو بتایا کہ آپ کی موٹر سائیکل ماں کی نافرمانی کی سزا کے طور پر بند ہوئی تھی۔ آپ کے گھر والوں کے نزدیک موٹر سائیکل کی مادی مشینری کے بند ہونے کی وجہ نافرمانی ہے۔ جو کہ ایک تصور ہے۔ یہ رویہ خیالی یا مابعد الطبیعی رویہ کہلاتا ہے۔

2۔ دوسری مثال یہ کہ آپ کا کوئی قریبی عزیز بیمار پڑ گیا تھا۔ جس کو آپ ہسپتال لے گئے تھے ڈاکٹر نے ابتدائی چیک اپ کے بعد کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیئے تھے جو لیبارٹری سے کروانے تھے۔

یہ ٹیسٹ میڈیکل ٹیکنالوجی کے ذریعے بیماری کی وجوہات کو جسم کے اندر تلاش کرنے میں مدد دیتے ہیں میڈیکل سائنس کا سارا علم ہی بیماری کی وجوہات کو انسانی جسم کے اندر تلاش کرنے کی تحقیق ہے۔ اب ٹیسٹ کے نتائج آ چکے ہیں اور رپورٹ کے مطابق جگر کی بیماری ہیپا ٹائٹس تشخیص ہوتی ہے۔ لیکن تیمار داری کرنے والے عزیز و اقارب اور خواتین کا موضوع یہ ہے کہ پچھلے دنوں یہ نوجوان شادی کی تقریب میں بوسکی کا سوٹ پہنے، گلے میں سونے کا لاکٹ لٹکائے۔ چہرے پر مسکراہٹ سجائے ہجوم میں گھوم رہا تھا اور بہت پیارا لگ رہا تھا۔ بس کسی کی نظر کھا گئی۔ نظر بد سے اللہ بچائے پتھر پھاڑ دیتی ہے۔ ان لوگوں نے جگر کے مادی وجود میں خرابی کی وجہ تصوراتی نظر بد پہچانی ہے۔ ڈاکٹر کے مادی رویے کے مقابلے میں ان کا رویہ تصوراتی، ماورائی یا خیالی ہے۔

3۔ تیسری مثال یہ تھی کہ جب 2005 میں زلزلہ آیا تھا تب آپ نے دیکھا کہ زلزلے کے جھٹکے محسوس کرتے ہی لوگ استغفار پڑھتے ہوئے کھلی جگہ کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ محکمہ ارضیات نے میڈیا کو بتایا تھا کہ زلزلہ کی شدت کیا تھی؟ اس کا مرکز کونسا تھا اور یہ کتنی گہرائی پر وقوع پذیر ہوا ان کا کہنا ہے کہ ہماری زمین ٹیکٹونک پلیٹوں سے بنی ہے۔ جب یہ پلیٹیں کھسکتی ہیں تو زلزلہ آتا ہے۔ لیکن انہی دنوں پرائیویٹ چینلز پر علمائے کرام ٹاک شوز میں زلزلے پر گفتگو کرنے کے لیے مدعو کیے گئے تھے۔ ان علما کا متفقہ خیال یہ تھا کہ نہ صرف زلزلے بلکہ سیلاب اور دیگر آفات ناگہانی بھی ہمارے برے اعمال کی سزا کے طور پر آسمان سے نازل ہوتی ہیں۔ زمین کے مسئلے آسمانوں سے نازل ہوتے ہیں پھر ان کے حل بھی آسمانوں سے آتے ہیں ان تینوں مثالوں میں نافرمانی، نظر بد اور برے اعمال جیسے تصورات ٹھوس اور مادی چیزوں میں حرکت و تبدیلی کا سبب بنے ہیں۔ یہ نظریہ کہ کوئی خیال یا تصور جو ہمارے ذہن کے اندر موجود ہوتا ہے وہ ہمارے خارج میں کسی مادی چیز پر اثر انداز ہو کر اس میں حرکت پیدا کرتا ہے یا کبھی کبھی تبدیلی کا باعث بنتا ہے ایسے یقین کو تصوریت کہتے ہیں۔

میں نے اپنی شعوری ناپختگی کی عمر میں "خیال کی طاقت" کے نام کی ایک کتاب ایک میلے پر خریدی۔ اس کتاب میں پیش کیے گئے خیالات اور بتائے گئے تجربات سے اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے اس کتاب میں پیش کیے گئے تجربات میں سے ایک کو آزمانے کی ٹھان لی۔ لوہے کا دو کلووزنی گولا لیا۔ اس پر سفید روغن سے ایک چھوٹا سا دائرہ بنایا۔ موم بتی کی روشنی میں رات کے

تیسرے پہر مخصوص وقت کے لیے اپنی دونوں آنکھوں کی نگاہ کو سفید نشان پر مرکوز کرتا تھا۔ 40 دن بعد لوہے کے گولے نے آنکھ کے اشارے سے میں جس طرف چاہتا گھوم جانا تھا۔ مگر 40 دن تو کیا سارا سال یہی مشق دہرانے سے بھی لوہے کا گولا ٹس سے مس نہ ہوا۔ لیکن میں نے کبھی اس خیال کو غلط نہیں سمجھا کہ لوہے کا گولا توجہ مرکوز کرنے سے حرکت میں آجاتا ہے بلکہ ہر بار اپنی ہی غلطی تلاش کرتا رہا کہ مجھ میں کیا کمی رہ گئی کہ لوہے کا گولا حرکت میں نہیں آیا (ایسی رائے کو عقیدہ بھی کہتے ہیں)۔

انہی دنوں برطانیہ میں زیر تعلیم میرے ایک دوست پاکستان آئے ہوئے تھے انہوں نے مجھے لندن کی کسی سپر چوئل (spiritual) سوسائٹی کا واقعہ بتایا جس میں وہ خود موجود تھے۔ ان کے مطابق ہم 6 لوگوں نے لڑکیاں اور لڑکے میز کے اردگرد بیٹھ کر اس پر پڑے گلاس پر توجہ مرکوز کی تو ہم نے اس گلاس کو اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ اس پر مجھے اور بھی یقین ہو گیا کہ یہ نظریہ کہ کوئی مادی چیز انسانی نظر کی توجہ سے ہلائی جا سکتی ہے درست ہے بس مجھ ہی میں کوئی خامی ہے جو میں ایسا نہیں کر سکا۔

ہماری رواجی تصوریت یہ ہے کہ کسی شخص کے خیال، جذبے یا خواہش سے ہمارے خارج میں موجود کسی مادی شے میں حرکت و تبدیلی ممکن ہے۔ قوت محرک خیال یا تصور ہے اور مفعولی چیز مادہ ہے۔

علی عباس جلالپوری نے ایسی تصوریت کو انسانی شعور کا بچپن کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بچے کو خارجی عالم کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اس کی خواہشات اور خیالات خارجی عالم پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً اس کی بھوک فوری طور پر دودھ مہیا کر دیتی ہے۔ وہ لوگ جو جسمانی طور پر بالغ ہونے کے باوجود ذہنی اور نفسیاتی پہلو سے نابالغ ہی رہتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مجرد خواہش خود اپنی تکمیل کی صورت اختیار کر لیتی ہے کچھ خیالات لازمی طور پر فلسفہ سے ماخوذ نہیں ہوتے بلکہ انہیں عام لوگ اپنی زندگی کے تجربے سے اخذ کرتے ہیں اور فلسفی انہیں ایک باقاعدہ نظام فکر کی شکل دے دیتا ہے۔

لہٰذا یہ خیال کہ آپ کے احساسات، جذبات، تخیلات، عقائد اور چیزوں کے بارے میں آپ کی رائے کسی مادی چیز میں حرکت و تبدیلی کا سبب ہے۔ یہ تمام خیالی بیرونی عامل مادے

میں حرکت و تبدیلی کا باعث بنتے ہیں ایسا یقین تصوریت کہلاتا ہے پاکستانی معاشرہ چونکہ تصوریت، ماورائیت، مابعد الطبیعات کی بنیادوں پر استوار کیا گیا معاشرہ ہے۔ اس لیے ہماری روز مرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ ہمارا معمول ہیں عام لوگوں کے عقائد میں پائی جانے والی ایسی تصوریت کو رواجی تصوریت کہا گیا ہے۔

فلسفیانہ تصوریت

تصوریت کے فلسفیانہ پہلو کو سمجھنے کے لیے روز مرہ زندگی کے چند تجربات کو ذہن میں رکھیئے فرض کریں آپ اس مخصوص کتاب کو دیکھ رہے ہیں۔ اُس کتاب کا ایک مادی وجود ہے جس کا نقش یا عکس آپ کے ذہن میں موجود ہے۔ آپ کے ذہن میں نقش یا عکس کا انحصار خود اس کتاب پر ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ کتاب آپ کے سامنے نہ ہو تو اس کا نقش یا عکس بھی نہیں ہوگا۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ میں پھر بھی کتاب کا تصور ذہن میں لا سکتا ہوں۔ مگر یہ تصور پہلے کے کسی نقش کی بازیافت ہوگا۔ آپ کے ذہن میں اس کتاب کے تصور یا تاثر کا ہونا اس بات کی شہادت ہے کہ خارج از ذہن حقیقت میں کوئی شے موجود ہے جس کو آپ کتاب کہتے ہیں۔ جو چیز خارج از ذہن حقیقت میں موجود نہ ہو آپ اس کا ادراک بھی نہیں کرتے۔ جیسے اگر آپ کو کسی ایسی مخلوق کا ذکر کیا جائے جو مریخ پر رہتی ہے۔ پانی اور آکسیجن کے بغیر زندہ ہے انسان جیسی بالکل نہیں ہے تو آپ زمین پر موجود مخلوقات کے آپ کے ذہن میں موجود تصورات کی مدد سے کوئی قیاسی تصور بنانے کی کوشش کریں گے۔ ہر شخص اپنا الگ الگ قیاسی تصور قائم کرے گا۔

اس کے برعکس میزیں اور کرسیاں وغیرہ چونکہ کمرے میں موجود ہیں لہٰذا ان کے نقوش اور تاثرات بھی آپ کے ذہن میں اسی طرح ہوتے ہیں جیسی کہ وہ چیزیں ہیں۔ جس طرح آئینے کے سامنے کوئی چیز ہو تو اس کا عکس آئینے میں ہوگا اس طرح خارج از ذہن کوئی شے حقیقت میں معروضی طور پر موجود ہو تو اس کا خیال یا تصور بھی ذہن میں ہوگا۔ آئینے میں عکس کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ خارج میں کوئی چیز ہے اور ذہن میں کسی عکس کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی شے خارج میں موجود ہے۔

فرض کریں آئینے کو اس شے کے سامنے سے ہٹالیا جائے۔ کیا اس شے کا وجود ختم ہو جائے گا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اس شے کی اپنی مستقل بالذات حیثیت ہے۔ وہ کسی آئینے میں منعکس نہ ہو تب بھی وہ قائم رہے گی۔ کتاب کا وجود تب بھی قائم رہے گا جب آپ اسے الماری میں رکھ کر باہر چلے جائیں گے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہے کہ ذہن میں کسی تصور کا ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ خارج از ذہن حقیقت میں اس تصور سے متعلقہ کوئی شے معروضی طور پر موجود ہے، یہ ساری باتیں آپ کی روزمرہ زندگی کا مشاہدہ ہیں۔

لیکن افلاطون اس کے برعکس یہ کہتا ہے تصورات کا اپنا الگ اور آزاد وجود ہے۔ یہ کتاب جو آپ پڑھ رہے ہیں اس کے حروف قائم بالذات یا خود مکتفی نہیں۔ حروف کا وجود کاغذ کے وجود کا رہین منت ہے۔ کاغذ ہے تو حروف بھی ہیں۔ کاغذ جلا دیا جائے تو حروف کا وجود کاغذ کے بغیر ممکن نہیں ہوگا۔ لیکن افلاطون کہتا ہے کہ یہ حروف خود مکتفی ہیں انہیں اپنے وجود کے لیے کسی کاغذ کی احتیاج نہیں۔

مٹھاس از خود قائم نہیں کیونکہ یہ ایک تصور ہے۔ اس کا کسی میٹھی چیز میں ہونا ضروری ہے جیسے کیلا یا سیب مگر افلاطون کے نزدیک مٹھاس چونکہ عمومی تصور ہے اس کا وجود از خود قائم ہے۔ افلاطون تصورات کو ذہن سے آزاد اور قائم بالذات حقیقت مانتا ہے ان تصورات کو افلاطون نے امثال کا نام دیا ہے۔

افلاطون کے نظریے کو سمجھنے کا راز اس بات کو سمجھنے میں پوشیدہ ہے کہ اس نے تصورات کو امثال کیوں کہا ہے۔ افلاطون خود اس کی وضاحت اس طرح کرتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ سنگ تراش کے سنگ مرمر کے ٹکڑے سے گھوڑا تخلیق کرنے کے عمل کو سمجھو۔ اس تخلیق کو سمجھنے کے لیے ہم اس عمل کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) سنگ تراش کے ذہن میں گھوڑے کا نقش، آئیڈیا یا تصور (۲) سنگ مرمر کا بے صورت ناتراشیدہ مادی ٹکڑا (۳) اور سنگ تراش خود۔

سنگ تراش نے اپنے ذہن میں موجود گھوڑے کے تصور کو سنگ مرمر کے مادی ٹکڑے پر ثبت کر دیا اور اس کو اپنے ذہن میں موجود تصور کی مثل یا تصور کی عین بنا دیا۔ سنگ تراش کے ذہن

میں گھوڑے کے تصور کی چھاپ یا مثل سنگ مرمر کے ٹکڑے پر منتقل ہو گئی۔ لیکن اگر ہم سنگ مرمر کے گھوڑے کی تخلیق کے عمل سے سنگ تراش کو نکال دیں تو باقی دو چیزیں رہ جاتی ہیں۔ (۱) گھوڑے کا تصور (۲) سنگ مرمر کا مادی ٹکڑا۔

سنگ تراش کو ان تین چیزوں میں سے اس لیے نکالا ہے کہ افلاطون تک کے یونان میں خدا کا تصور موجود نہیں تھا۔ افلاطون کے نزدیک آئیڈیاز، تصورات اور تخیلات وہ امثال ہیں جن کی چھاپ سے مادی عالم کی اشیاء بنتی ہیں۔ یہ امثال غیر مخلوق ہیں اور ازلی ہیں مادی عالم کی اشیاء ان امثال کے سائے ہیں یہ امثال لاتعداد ہیں اور کسی دوسری دنیا میں پائی جاتی ہیں اس دنیا کا نام بھی افلاطون نے عالم امثال رکھا ہے اسی نسبت سے افلاطون کی تصوریت کو مثالیت کا نام دیا گیا ہے۔

افلاطون کے نزدیک عالم امثال سکونی ہے۔ اس میں حرکت و تبدیلی نہیں ہوتی۔ عالم امثال ہی حقیقی دنیا ہے اور یہ دنیا جس میں ہم رہ رہے ہیں یہ ہماری نظر کا دھوکا ہے یہ ظاہری دنیا چونکہ حرکت و تبدیلی کے عمل سے گزرتی ہے اس لیے یہ فانی اور عارضی ہے۔

مادی دنیا میں حرکت و تبدیلی عالم امثال کی وجہ سے ہوتی ہے۔ عالم امثال میں موجود تصورات ہی مادی دنیا کو چلا رہے ہیں۔

جس طرح خیر، صداقت اور حسن کے امثال ہیں اس طرح شر، بدصورتی اور خبائث کے بھی امثال ہیں۔ یہ سب امثال منتشر حالات میں نہیں ہیں بلکہ مرتب و مدون شکل میں موجود ہیں۔ فلسفیانہ تصوریت کا بنیادی نقطہ بھی یہی ہے کہ مادے میں حرکت و تبدیلی عالم امثال میں موجود تصورات کی وجہ سے رونما ہوتی ہے۔ جس طرح رواجی تصورات میں ہم نے دیکھا تھا کہ ہمارے تصورات، خواہشیں، ارادے اور جذبات بھی ہماری اردگرد موجود مادی دنیا میں حرکت و تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔

فلسفیانہ تصوریت اور مذاہب کے پیدا ہونے کے درمیانی عرصے میں افلاطون کی امثال خدا کی صفات میں تبدیل ہو گئیں بعض فلسفیوں نے تو ان امثال کو خدا کے افکار قرار دیا۔ تصوریت کی جتنی بھی قسمیں ہیں ان کا مرکزی خیال ایک ہی ہے۔ وہ یہ کہ تصورات نہ صرف مادی دنیا کو چلاتے ہیں بلکہ یہ تصورات ہی ہیں جو معاشرے کو حرکت و تبدیلی کے عمل سے گزارتے ہیں۔ ان کے نزدیک اچھے اور ترقی کے خیالات سے ترقی ہوتی ہے اور پسماندگی کی وجہ پسماندہ خیالات ہیں۔

تصوریت کا نظریہ علم

تصوریت، مثالیت، خیالیت، الغیب، ماورائیت یا مابعدالطبیعات اس فکری نظام کا جو کوئی بھی نام ہو اس کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ مادی کائنات اور معاشرے میں حرکت و تبدیلی کسی بیرونی خیال کے اس پر اثر انداز ہونے سے رونما ہوتی ہے۔ اس نقطے کو ہم ایک تصوریت پرست کے ایک بیان کی روشنی میں سمجھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "اگر محض ایک خیال ایک دماغی ایٹم کو حرکت میں لا سکتا ہے تو یہ اسی آسانی سے پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہٹا سکتا ہے یا چاند کے راستے کو بھی بدل سکتا ہے۔" یہ استدلال تصوریت کو سمجھنے کی بہترین مثال ہے۔

توجیہہ کا مطلب ہے وجہ بیان کرنا۔ انسانی تہذیب کی ابتداء کا انسان جہاں کہیں مخصوص قدرتی مظاہر دیکھتا تھا اس کی خودساختہ توجیہہ بنالیا کرتا تھا۔ عام آدمی کی فکر حسی ادراک کے تابع ہوا کرتی ہے اس کے نزدیک صرف وہی چیز حقیقی ہوتی ہے جو نظر آتی ہے وہ اسی سے نتیجے بھی اخذ کرتا ہے اور اخذ کیے گئے نتیجوں کو اصول کے طور پر دیگر مشاہدوں پر لاگو بھی کرتا ہے۔ عام آدمی کی زندگی کا تجربہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ کوئی مادی بیرونی عامل ہی کسی مادی شے کو حرکت میں لاتا ہے یا اس کو تبدیلی کے عمل سے گزارتا ہے۔ اس کے لیے اس بات پر یقین کرنا آسان تھا کہ ایسی تبدیلیاں جن میں حرکت و تبدیلی کا بیرونی عامل انہیں نظر نہیں آتا وہ عامل یقینی طور پر خیال یا تصور ہوگا۔

فطری مظاہر کی مادی توجیہہ سمجھنے کی بجائے انسان کے قیاس کی پرواز آسانی سے سمجھ میں آ جانے والی کسی تصوراتی ہستی کی طرف موڑ دی جاتی تھی۔ بادلوں کی گرج کے مظہر کو وہ گرج کے دیوتا کی طرف منسوب کر دیتا تھا۔ زلزلے کی کوئی دوسری توجیہہ وہ اپنی طرف سے بنا کر بیان کر دیتا تھا۔ انسانی معاشرے میں رونما ہونے والے مظاہر، واقعات، خوشحالی یا بدحالی کو، یہاں تک کہ

زمین کی زرخیزی کی وہ کوئی قیاسی توجیہہ گھڑ لیا تھا۔ جسم کے اعضاء کی حرکت کی توجیہہ وہ چھپی ہوئی حیاتی قوت یعنی روح سے کرتا تھا اور روح کو انسانی جسم میں بیرون سے داخل ہوئی سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح شعور اور شعوری حالتوں کی توجیہہ روح کے مظاہر کے طور پر کی جاتی تھی۔ شعور، علم، فہم و ادراک کو بھی روح ہی کے اعمال کے طور پر تصور کیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ شعور کو بھی روح ہی کی طرح کسی دوسری دنیا سے انسان کو ودیعت کیا گیا قیاس کیا جاتا تھا۔

دنیا کے تمام تر مذاہب بھی الگ الگ ناموں سے تصوریت ہی کی مختلف شکلیں ہیں مذاہب کا نظریہ علم بھی عین وہی ہے جو فلسفیانہ تصوریت کا ہے۔ افلاطون نے اگرچہ اپنے زمانے اور اس سے پہلے کے خیال پرستوں کے ٹوٹے پھوٹے، نامکمل اور ادھورے خیالات کو اکٹھا کر کے اسے ایک باقاعدہ نظام فکر کی شکل میں پیش کیا مگر پھر بھی افلاطون ہی کو فلسفیانہ تصوریت کا بانی سمجھا جاتا ہے اس وجہ سے ہم تصوریت کے نظریہ علم کو افلاطون کے بیان کیے ہوئے طریقے پر سمجھیں گے۔

مادیت کی طرح تصوریت کے بھی تین اجزائے ترکیبی ہیں (۱) نظریہ وجود (۲) نظریہ حرکت اور (۳) نظریہ علم۔ یہ تینوں اجزاء آپس میں اس طرح پیوست ہیں کہ نظریہ وجود (Ontology) اور نظریہ علم (Epistemology) کو علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

نظریہ وجود کو سمجھنے کے لیے آیئے مادے اور خیال کو بھی اس انداز میں سمجھیں کہ جس انداز میں افلاطون نے اسے پیش کیا ہے۔ اس کے لیے ہم خیال یا تصور کی بجائے تعقل کا لفظ استعمال کریں گے تاکہ روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والے الفاظ خیال یا تصور اور افلاطون کے تعقل کے مفہوم میں فرق کو واضح کیا جا سکے۔

اگر ہم کہیں کہ "یہ فلسفے کی کتاب ہے، تو ہمارا اشارہ اس مخصوص کتاب کی طرف ہے جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ "زید انسان ہے" تو ہم ایک خاص شخص کی طرف اشارہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح اگر یہ کہا جائے کہ 'دریائے سندھ پاکستان کا سب سے بڑا دریا ہے؟ تو سمجھو کہ یہ ایک خاص دریا کی بات ہو رہی ہے۔

لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ "کتاب بہترین ساتھی ہے" تو ہمارا اشارہ کسی مخصوص کتاب کی طرف نہیں ہے، ہر کتاب خواہ وہ قرآن کریم ہو، داس کیپٹل ہو یا ڈکشنری اس کا ایک مشترک نام کتاب ہے۔ یہاں کتاب کا عمومی تصور مراد ہے جو دنیا بھر کی تمام کتابوں پر حاوی ہے۔ اگر یہ کہا

جائے کہ ''انسان فانی ہے'' تو اس سے کوئی خاص انسان مراد نہیں۔ اس سے ہر انسان مراد ہے خواہ وہ زید ہو، بکر یا عمر دنیا کی ساڑھے سات ارب کی آبادی کا ہر انسان مراد ہے۔ کیونکہ ساڑھے سات ارب انسانوں میں ہر ایک کا اپنا الگ نام ہے اور سب کا مشترک نام ''انسان'' بھی ہے۔ ''انسان'' عمومی نام ہے۔ تعقل ہے

دنیا بھر کے تمام دریا ایک مشترک نام ''دریا'' سے بھی جانے جاتے ہیں اور ہر ایک کا ایک خاص نام بھی ہے۔ کسی ایک نوع یا ایک طرح کی چیزوں کے مشترک نام کو افلاطون نے تعقل کا نام دیا ہے۔ تعقلات دراصل وہ تصورات مجردہ (General Ideas) ہوتے ہیں جو انسانی عقل ایک ہی قسم کی اشیاء میں لازم اور مشترک خصوصیات کو علیحدہ کر کے ان کی جماعت بندی (Classification) کر دیتی ہے۔ جماعت بندی کرنے کا عمل دراصل تعقلات وضع کرنے کا عمل ہے۔ اس عمل میں حواس کا کوئی دخل نہیں یہ ماورائے حس عقل کا کام ہے۔

افلاطون کے نزدیک یہی تعقلات کائنات کی تخلیق و آفرینش کا سرچشمہ ہیں۔ انسانی زندگی میں خیال یا تصور کو اپنے وجود کے لیے ذہن کی احتیاج ہے۔ یہ ذہن کے اندر موجود ہوتے ہیں ذہن کے باہر ان کا وجود ممکن نہیں ہمارے تصورات اور افلاطون کے تعقلات میں فرق یہ ہے کہ افلا طون کے آئیڈیاز یا تعقلات قائم بالذات ہیں۔ خود مکتفی ہیں۔ ذہن کے باہر اپنا آزاد وجود رکھتے ہیں۔ ان کے وجود کا انحصار کسی بھی ذہن پر نہیں۔ یہ لافانی ہیں اور غیر مخلوق ہیں۔ افلاطون کے مطابق اگر خدا کو خالق کے معنوں میں لیا جائے تو خدا کا شخصی ہونا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے خدا ''خیر'' نامی تعقل کا بھی خالق ہوگا۔ یعنی خیر کا تصور اپنے وجود کے لیے خدا کا رہین منت ہوگا یہ تعبیر تعقلات کی نوعیت کے خلاف ہے۔ تعقلات ازلی حقیقت ہیں اگر خدا ان کا خالق ہے تو یہ غیر مکتفی نہیں رہیں گے۔ افلاطون نے تعقلات، آئیڈیاز کو اپنی اصطلاح میں امثال کا نام دیا ہے۔

امثال لاتعداد ہیں۔ جس طرح خیر، صداقت اور حسن کی امثال ہیں اس طرح شر، بد صورتی اور خباثت کے امثال ہیں۔ یہ سب امثال منتشر حالت میں نہیں ہیں بلکہ مرتب و مدون صورت میں موجود ہیں۔ ان کی ترتیب منطقی ہے۔ سب سے اعلیٰ اور اکمل مثل ''خیر مطلق'' ہے جو سب کا مبداء ہے۔

افلاطون نے فرض کر لیا کہ اس مادی دنیا کی موجودات سے ماوراء ایک ایسی دنیا ہے جہاں

یہ امثال موجود ہیں۔ اس ماورائی دنیا کا نام عالم امثال ہے۔ عالم امثال دراصل عالم غیب ہے جو زمان و مکان سے ماوراء ہے لہٰذا اس کا حسی ادراک ممکن نہیں۔ نہ انہیں دیکھا جا سکتا ہے نہ چھوا جا سکتا ہے اور نہ سونگھا یا چکھا جا سکتا ہے۔

افلاطون کے نظریہ وجود کا خلاصہ یہ ہے کہ مادی دنیا غیر حقیقی ہے۔ جن اشیاء کا ادراک ہمارے حواس کرتے ہیں وہ حقیقی امثال کے محض سائے ہیں۔ افلاطون نے مادے کو عدم محض یا غیر حقیقت (Not-being) کا نام دیا ہے۔ افلاطون کے نزدیک تمام صفات اور خصوصیات امثال کی وجہ سے ہوتی ہیں، مثلاً سونے کی زردی چمک اور وزن امثال کی وجہ سے ہے۔ اگر سونے میں سے چمک، زردی اور وزن اور دیگر تمام صفات نکال دی جائیں تو باقی کیا بچے گا؟ یقیناً عدم محض افلاطون عالم موجودات کو مادی دنیا کو عالم امثال کے عکس یا سائے قرار دیتا ہے۔ مادے اور تصورات کے تعلق کی وضاحت وہ مندرجہ ذیل مثال سے کرتا ہے۔

فرض کیجئے ایک غار کے اندر کچھ قیدی ایک قطار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ قیدی زنجیروں میں کچھ اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ وہ صرف سامنے والی دیوار کی طرف ہی دیکھ سکتے ہیں۔ قیدیوں کے پیچھے ایک چھوٹی سی دیوار یا سٹیج ہے۔ اس دیوار یا سٹیج کے ساتھ ساتھ کوئی پراسرار مخلوق ہاتھوں میں مختلف اشیاء اور جانوروں کے مجسمے اٹھائے اس طرح گزر رہی ہے کہ یہ مجسمے دیوار سے اوپر رہتے ہیں۔ سٹیج سے کافی پیچھے آگ روشن ہے۔ جس کی وجہ سے مجسموں کے سائے سامنے والی دیوار پر پڑ رہے ہیں۔ غار کے قیدی صرف سامنے والی دیوار پر مجسموں کے سائے ہی دیکھ سکتے ہیں پیچھے مڑ کر اصل مجسموں کو نہیں دیکھ سکتے۔ قیدیوں سے مراد اس دنیا کے لوگ ہیں جو حواس خمسہ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں لہٰذا وہ ان سایوں ہی کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جو کہ ازلی و ابدی و حقیقی تصورات سامنے کی دیوار پر ڈال رہے ہیں، ان سایوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ مادہ فریب نظر ہے۔ دھوکا ہے۔ حقیقی عالم صرف عالم غیب ہے۔ تصوریت کے فکری نظام کا دوسرا اہم پہلو اس کا نظریہ حرکت ہے۔ تصوریت کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ مادی کائنات میں حرکت و تبدیلی کسی بیرونی خیال کے بطور عامل اس پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے رونما ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی اس اہم نقطہ کو بیان کیا جا چکا ہے کہ افلاطون کے نظریہ حقیقت (Ontology) کو اس نے نظریہ علم (Epistemology) سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اس طرح اس کے نظریہ حرکت بھی الگ

نہیں کیا جاسکتا۔

افلاطون کے نزدیک دنیائیں دو ہیں۔ایک ظاہری عالم، مادی کائنات یا مجازی دنیا ہے اور دوسری عالم غیب، امثال یا تصورات کی دنیا یا حقیقت ہے۔ حقیقت (Reality) اور مجاز (Appearance) کے فرق کو افلاطون نے اس طرح بیان کیا ہے اور حرکت وتبدیلی کا نظریہ بھی اسی سے اخذ کیا ہے۔وہ یہ کہ

حقیقت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز جامد وساکت ہو، ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہے۔ قیام پذیر ہو۔ازل سے ابد تک قائم ودائم رہے۔نہ پیدا کی گئی ہو نہ کبھی معدوم ہو۔زمان ومکان سے ماوراء ہو۔سکونی ہو، آفاقی ہو، مستقل بالذات ہو اور معروضی ہو، وہی حقیقت مطلقہ ہے اور وہ عالم امثال یا تصورات کی دنیا ہے۔

مجاز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مادی وجود رکھتی ہو۔ظاہری شکل وشباہت میں موجود ہو۔ وجود ہونے کی افلاطون کے نزدیک دو شرائط ہیں۔زمان ومکان۔ہم اس شے کو موجود کہتے ہیں جو کسی جگہ پر ہو اور کسی لمحے میں ہو (فلسفہ کی زبان میں لمحے یا وقت کو زمان اور جگہ کو مکان کہتے ہیں)۔زمان ومکان کی قید میں جو بھی شے ہوگی وہ موجود ہے، ہر موجود شے کی کوئی جگہ مقام یا تاریخ ہوتی ہے۔مثلاً انسان جب تک زندہ رہتا ہے کسی نہ کسی جگہ پر اور تاریخ کے کسی نہ کسی لمحے میں موجود رہتا ہے۔جب وہ وقت اور جگہ کی قید سے نکل جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ موجود نہیں ہے یعنی زندہ نہیں ہے۔جو بھی کسی جگہ پر ہوگا مخصوص اور متعین شے ہوگی۔عالم ظاہر یا مادی دنیا زمان ومکان کی قید میں ہے۔اس میں تکوین ہے۔اشیاء کا وجود میں آنا ان کا ارتقائی منازل طے کرنا۔ان کا معدوم ہو جانا کائنات کے اس ظاہری پہلو کی خصوصیت ہے۔مادی دنیا کی کوئی چیز قیام پذیر نہیں ہے مستقل نہیں ہے۔ایک حالت پر قائم نہیں رہتی اس لحاظ سے یہ دنیا، مادی کائنات غیر حقیقی ہے یا مجازی ہے۔

مادی کائنات عالم امثال کی پرچھائی ہے۔اس میں حرکت وتبدیلی بھی امثال یا تصورات کی وجہ سے رونما ہوتی رہتی ہے۔مادہ وہ خام مواد ہے جس پر امثال کی چھاپ لگتی رہتی ہے۔مادی دنیا کی تخلیق ہی امثال کی چھاپ لگنے سے ہوئی اس میں حرکت وارتقا بھی تصورات یا امثال کے اس پر بطور عامل اثر انداز ہونے سے رونما ہوتے ہیں۔وجود اور حرکت کا یہ نظریہ ایک دوسری شکل

میں دنیا کے تمام تر مذاہب کے عقائد کا لازمی جزو ہے۔بیرونی عامل کے اثر انداز ہونے کی وجہ سے مادے میں حرکت کے نظریہ کے مطابق ڈیموکرائٹس کا ایٹم سخت اور ٹھوس زندہ ہونے کی حیثیت سے مادیت سے نہیں بلکہ مابعد الطبیعات سے تعلق رکھتا ہے۔

کسی فلسفیانہ نظام کو سمجھنے کے لیے ہمیں پھر اس راہ پر چلنا چاہیے جس پر چلنے سے ابتدا میں اس کی تعمیر ہوئی تھی۔افلاطون نے تاریخ فلسفہ یونان میں پہلی مرتبہ ایک ایسا نظام فکر پیش کیا جو کائنات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں مثلاً سیاسیات، اخلاقیات، طبیعات، مابعد الطبیعات اور عملیات پر حاوی ہے۔ایک فلسفیانہ اصول کا اتنا ہمہ گیر اطلاق یقیناً افلاطون کے ذہن کے انتہائی منظم اور مربوط ہونے کا شاہد ہے۔تصوریت کے نظریہ علم کی عالمگیریت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ یہ دنیا بھر کے تمام تر مذاہب کے بنیادی عقائد کا لازمی حصہ ہے۔

بقائے روح کا عقیدہ افلاطون کے نظریہ علم کے ساتھ نہایت قریبی تعلق رکھتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک روح بھی امثال کی مانند ہے چنانچہ یہ بھی امثال ہی کی طرح غیر فانی ہے۔ عقل اور شعور روح ہی کا لازمی جزو یا روح کا خاصہ (Characteristic) ہے۔مذاہب کے عقائد کے مطابق عقل وشعور بھی روح کے لازمی عنصر کے طور پر آسمان سے ودیعت کیے گئے ہیں۔

روح جسم میں داخل ہونے سے پہلے کسی اور دنیا میں موجود تھی۔انسان کی پیدائش پر جب اس کا تعلق جسم سے قائم ہو جاتا ہے تو پیدائشی طور پر انسانی ذہن میں متعدد ایسے تصورات ہوتے ہیں جو جسم (حواس خمسہ) کے توسط سے حاصل نہیں ہوتے۔حواس کے توسط سے جو علم حاصل ہوتا ہے نامکمل ہوتا ہے۔افلاطون اس زندگی میں ہر صحیح علم کو پہلی زندگی میں دیکھتے ہوئے تصورات کی یاد قرار دیتا ہے۔اس کے نزدیک تمام علم بازیافت (Recollection) ہے۔

افلاطون کے نزدیک مادی دنیا غیر حقیقی ہے۔ہماری نظر کا دھوکا ہے۔حقیقت مادی دنیا سے ماوراء ہے۔حواس خمسہ صرف اس شے کا احاطہ کر سکتے ہیں جو زمان ومکان کی قید میں ہو، مادی دنیا محسوسات کی دنیا ہے۔اس کے برعکس عالم غیب یا حقیقت محسوسات سے نہیں بلکہ معقولات سے استدلال سے اور تجریدات فکری سے حاصل ہوتا ہے۔غیر مدرک وجود کا مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا لہٰذا ہم اسے استنباط کے ذریعے جان سکتے ہیں۔

کائنات ایک زندہ جسم کی طرح ہے جس کے اندر روح ہے عقل روح ہی کا خاصہ

(Property) ہے۔اس لیے کائنات کے نظام میں عقل کی کارفرمائی نظر آتی ہے، کائنات ایک عقلیاتی کل ہے، جس کی حقیت کا ادراک صرف عقل استدلالی ہی کر سکتی ہے۔

علم دراصل عالم غیب، عالم امثال یا حقیقت سے آگاہی کا نام ہے۔ ہر فرد میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔ یہ جوہر قدرت نے لاکھوں کروڑوں انسانوں میں کسی ایک کو عطا کیا ہوتا ہے۔ وہ ایک افلاطون کے نزدیک فلسفی اور دنیا بھر کے مذاہب کے عقیدے کے مطابق انبیاء یا روحانی پیشوا ہوتا ہے، جو صدیوں میں کوئی ایک پیدا ہوتا ہے۔

•

تصوریت کے نظریہ علم کے مضمرات

تصوریت کا نظریہ علم ہو یا مذاہب و مسالک کے عقائد سے ماخوذ علم کے نظریے ان سب کا بنیادی نقطہ حسی ادراک کو ہر حالت میں ناقص، دھوکہ اور غلط ثابت کرنا ہوتا ہے۔ زیادہ تر مکاتیب فکر کے پاس تو علم کا کوئی متبادل نظریہ بھی نہیں ہوتا وہ اپنے اعتقادی استدلال سے حسی ادراک کو غلط ثابت کرنے ہی کو اپنا متبادل نظریہ سمجھتے ہیں۔ نتیجہ ان کے ذہن میں مقصد کی حیثیت سے پہلے موجود ہوتا ہے اپنا استدلال اس کے مطابق ترتیب دے لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ افلاطون نے ایک پورا مکالمہ، تھیائٹس (theaeteus) سوفسطائیوں کے اس نظریہ کو غلط ثابت کرنے کے لیے مختص کر دیا کہ ''علم حسی ادراک'' کا نام ہے۔

عالم غیب، عالم امثال، تصورات یا اعتقادات کی دنیا چونکہ مادی دنیا سے ماوراء قیاس کی جاتی ہے اور یہ کہ ماورائی قیاسی دنیا ہی حقیقت ہے، تصوریت کا مرکزی خیال ہے۔ حقیقت جو کہ ماورائے حس کہیں موجود ہے تو سوال یہ ہے کہ ماورائے حس دنیا کے بارے میں جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟ افلاطون نے کہا کہ حقیقت کا علم ''ماورائے حس عقل'' سے حاصل ہوتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ''ماورائے حس عقل'' کیا ہے؟ ایسی عقل جو حواس خمسہ سے الگ کوئی چیز ہے۔ آج کے انسان کے لیے حس اور عقل میں فرق کرنا مشکل ہے کیونکہ حواس خمسہ ہی ذہن کے وہ آلات ہیں جو بیرونی دنیا کی معلومات انسانی ذہن تک پہنچاتے ہیں۔ حواس کی فراہم کردہ معلومات سے ذہن جو نتائج اخذ کرتا ہے ان نتائج کو عقل کہتے ہیں۔ عقل میں آنے والی بات کو معقول بات کہا جاتا ہے اور جو بات عقل میں نہ آئے وہ معقول نہیں سمجھی جاتی۔ اگر آپ سے کوئی کہے کہ آپ کے کمرے کے روشندان سے اونٹ اندر گزر آیا ہے تو یہ بات عقل میں آنے والی

نہیں۔اسے معقول نہیں سمجھا جائے گا۔حالانکہ اس بات کا عقل میں نہ آنا بھی مشاہدے ہی کا نتیجہ ہے۔لیکن تصوریت میں عقل کا مفہوم اس عقل سے بالکل الگ ہے جو مشاہدوں کے نتائج اخذ کرنے سے تشکیل پاتی ہے۔

تصوریت کی عقل کائنات کو تخلیق کرنے والی عقل کا حصہ بنائی جاتی ہے۔اس کا حواس سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں یہ عقل روح کا حصہ ہے اور روح کے جزو کے طور پر آسمان سے ودیعت کی گئی ہے۔اس وجہ سے یہ حواس کی بجائے آسمان میں موجود کائناتی عقل کو اپنی معلومات کا ذریعہ بتاتی ہے۔چونکہ جس عقل نے کائنات کو تخلیق کیا ہے وہی کائنات کے رازوں کو جان سکتی ہے۔ہر انسان کی عقل اس قابل نہیں کہ وہ کائناتی عقل سے رجوع کر کے علم حاصل کر سکے۔کروڑوں، اربوں لوگوں میں کوئی ایک انسان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ کائناتی عقل یا روح میں ضم ہو کر اس سے کائنات کے رازوں کا علم حاصل کر سکے۔افلاطون ایسے ایک خاص انسان کو فلسفی کہتا ہے جبکہ مذاہب میں وہ انبیاء، اولیا، رشی، منی کہلاتے ہیں۔تصوریت کے نظریہ علم کے مطابق چونکہ ہر انسان اس قابل نہیں کہ وہ خود علم حاصل کر سکے تو اسے لازمی طور پر کسی ایسی ہستی کی فراہم کردہ معلومات پر ایمان لانا ہوگا جس کے متعلق وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ ہستی دانائے راز ہے کائنات کے تمام بھید، راز اور معلومات اس کی پہنچ میں ہیں۔عام لوگوں کی زبان سے آپ نے سنا ہوگا کہ فلاں بزرگ پہنچے ہوئے ہیں۔

تصوریت کے نظریہ علم کا اہم نقطہ یہی ہے کہ علم مشاہدے یا حسی تجربے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ کسی فلسفی مقدس ہستی، روحانی شخصیت یا دانائے راز ہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔یہ عام انسان کے بس کی بات نہیں۔اس لیے عام انسانوں کو چاہیے کہ وہ ان خاص لوگوں کی پیروی کریں اور ان کی بتائی ہوئی باتوں پر ایمان لے آئیں جن کے متعلق وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ ہستیاں پیدا ہی کائناتی رازوں کو عام انسانوں تک پہنچانے کے لیے ہوا کرتی ہیں۔اگر ہم تصوریت کے فلسفیانہ پہلو میں بتائی گئی دانائے راز ہستی جس کو فلسفی کا نام دیا گیا ہے اور مذاہب میں بتائی گئی کامل و اکمل شخصیت، روحانی پیشوا کو ایک ہی لفظ اتھارٹی میں سمو دیں تو تفہیم و بیان میں آسانی رہے گی۔

تصوریت کے نظریہ علم کے مطابق علم بذریعہ اتھارٹی ہی سچا علم ہے۔اس لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایسی اتھارٹی مانی جانے والی شخصیات کے اقوال کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔افلاطون نے

فرمایا علامہ اقبال نے فرمایا۔حضرت علیؑ نے فرمایا وغیرہ۔

یہ نظریہ کہ حواس علم حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں، بلکہ اتھارٹی ہے یا مشاہدہ علم حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ اتھارٹی علم کا ذریعہ ہے کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔رات کو آسمان پر ستارے آپ کو ٹمٹماتے ہوئے نظر آتے ہیں۔کوئی کامل ہستی اگر اس کی توجیہہ اس طرح کرتی ہے کہ یہ ستارے یا سیارے آگ کے الاؤ ہیں جو ہوا چلنے کی وجہ سے ادھر اُدھر جھولتے رہتے ہیں اور ادھر اُدھر جھولنے کو ہم ان کا ٹمٹمانا سمجھ لیتے ہیں۔حقیقت اس سے یہ منکشف ہوئی کہ ستارے اور سیارے دراصل آگ کے اٹھتے ہوئے شعلے ہیں اور کوئی مادی وجود نہیں رکھتے۔

تصوریت کی فکری ساخت رکھنے والے اس حقیقت کشائی پر اس قدر پختہ یقین رکھ لیں گے کہ اگر انہیں یہ دکھا بھی دیا جائے کہ کائنات میں تمام تر ستارے جس مادے سے بنے ہوئے ہیں یہ ستارہ بھی اسی ٹھوس مادے سے بنا ہوا ہے تو وہ تب بھی یقین نہیں کریں گے کیونکہ ان لوگوں نے جس ہستی کے اس قول پر یقین کیا ہے کہ ستارے آگ کے شعلے ہیں وہ ہستی ان کے نزدیک ایسی عقل یا روح رکھتی ہے جو ستاروں کی تخلیق کے وقت وہاں موجود تھی۔جس نے ستاروں کو اپنی آنکھوں سے بنتے دیکھا ہے یا اس نے یہ علم کشف یا مراقبے کے ذریعے براہ راست حاصل کیا ہے۔

تصوریت میں ایسی مقدس ہستیوں کے قول کو جھٹلانے کی گستاخی کے تصور سے ان کی روح کانپ جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ تصوریت یا اس کی موجودہ مروجہ شکل کے مذاہب نے انسانی حواس کو دھوکا، فریب اور عقل پر پردہ قرار دینا ہوتا ہے تا کہ ان پر بداعتمادی کو پختہ کیا جائے اور اتھارٹی کو حق اور حقیقت کشا ثابت کیا جائے۔

حسی ادراک کو فریب اور ناقص ثابت کرنے کے لیے روزمرہ زندگی کی کئی مثالیں دی جاتی ہیں اور فلسفے کی ہر کتاب میں آپ کو یہی ایک ہی طرز کی مثالیں ملیں گی۔مشاہدے یا حسی ادراک کو غلط ثابت کرنے کے لیے جو غلط مثالیں تسلسل اور تواتر سے چلی آ رہی ہیں ہم پہلے ان کا جائزہ لیتے ہیں۔

پہلی مثال درجہ حرارت کی محسوسات کی ہے۔

وہ یہ کہ تین چینی کے پیالے لیں۔ان کو ترتیب سے میز پر رکھیں۔دائیں جانب کے پیالے میں وہ پانی ڈالیں جس کا درجہ حرارت 10.c ہے، درمیانے پیالے میں 20.c اور بائیں

جانب کے پیالے میں 30c درجہ حرارت کا پانی ڈالیں۔ دائیں ہاتھ کی انگلی دائیں طرف کے پیالے میں کچھ دیر کے لیے ڈبو دیں اور بائیں ہاتھ کی انگلی بائیں طرف کے پیالے میں ڈبو دیں۔ کچھ دیر میں انگلیاں بھی وہی درجہ حرارت اختیار کرلیں گی جو پانی کا ہے۔ اب دونوں انگلیاں درمیان والے پیالے میں ڈال دیں جس کا درجہ حرارت 20c ہے۔ یہ پانی آپ کے دائیں ہاتھ کو گرم اور بائیں ہاتھ کو ٹھنڈا محسوس ہوگا۔ اس تجربے کو تصوریت پسندوں نے حواس کی فریب دہی کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ حالانکہ یہ درجہ حرارت کی نسبت اور اضافت کو ظاہر کرتا ہے۔ جو انگلی آپ نے 10.c والے پانی سے نکال کر 20.c والے پانی میں ڈالی ہے اس کے لیے 20c والا پانی نسبتاً گرم اور جو انگلی 30c درجہ حرارت والے پانی سے نکال کر 20c والے پانی میں ڈالی ہے اس کے لیے پانی نسبتاً ٹھنڈا ہے اب ویسے بھی درجہ حرارت کو انگلی سے محسوس کرنے کا زمانہ ختم ہوگیا ہے۔ اب درجہ حرارت کی پیائش کے لیے تھرمامیٹر سے کام لیا جاتا ہے جو کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ دوسری مثال کا تعلق علم بصریات (Optics) سے ہے، صاف پانی سے بھرے ہوئے شیشے کے گلاس میں اگر آپ پنسل ڈال دیں تو وہ آپ کو مڑی ہوئی یا ٹیڑھی نظر آئے گی باہر نکالو تو پنسل پھر سیدھی نظر آتی ہے۔ تصوریت کی فکری ساخت رکھنے والے اسے بھی نظر کا دھوکا حواس کا غلط اطلاع دینا، مشاہدے سے حاصل علم کا ناقص ہونا قرار دیتے ہیں جبکہ یہ مسئلہ حواس کا نہیں روشنی کے انعطاف کا ہے۔ جب روشنی لطیف واسطے (ہوا) سے کثیف واسطے (پانی) میں داخل ہوتی ہے تو اس کی شعائیں مڑ جاتی ہیں جس کی وجہ سے پنسل ہمیں ٹیڑھی نظر آتی ہے۔ ستارے بھی ہمیں روشنی کے انعطاف کی وجہ سے ٹمٹماتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

تیسری مثال ان کے پاس گنتی کی ہے وہ کہتے ہیں کہ آپ حسی تجربے کے بغیر ہی یہ بتا دیتے ہیں کہ 36 اور 79 کا مجموعہ 115 ہوتا ہے۔ یہ گنتی کا اعشاری نظام بھی انسان نے اپنی انگلیوں پر گنتی سے بنایا ہوا ہے۔ یہ نظام انسان کا اپنا تخلیق کردہ ہے۔ 36 اور 79 کا مجموعہ اعشاری نظام میں 115 ہے جب ہڑپہ یا وادی سندھ میں 8 کا گنتی کا نظام تھا تو ان کا سو (100) اعشاری نظام کے 64 کے برابر تھا۔ انسان کا اپنا ہی تخلیق کردہ نظام اس کے حسی تجربے ہی پر تعمیر کیا جاتا ہے۔

چوتھی دلیل جس کو تصوریت کی فکری ساخت رکھنے والے بڑی قاطع دلیل سمجھتے ہیں اور فاتح مادیت قرار دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر ہم حسی تجربے سے پرے خالق کائنات یا خدا کو جان

سکتے ہیں تو پھر کیوں نہیں ماورائے حس دوسری اشیا کو بھی جان سکتے ؟ ان کے نزدیک خدا کا تصور استدلالی، ماورائے حس عقل اور وہبی ہے۔ حالانکہ یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے کہ انسان خود خالق ہے۔ آپ اپنے اردگرد نظر دوڑائیں لاکھوں کی تعداد میں آپ کو انسان کی تخلیق کردہ چیزیں ملیں گی۔ انسان کے خالق ہونے کا حسی تجربہ اس کے ذہن میں اس طرح منعکس ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ آخر اس کا اور اس کے اردگرد کی مادی کائنات کا خالق کون ہے؟ انسانی فکری تاریخ کے تسلسل میں آپ کو ہزاروں قسم کے خالق کے تصورات ملیں گے کبھی وہ دیوی دیوتا تھے کبھی ان کا کوئی نام ہے۔ خدا کا تصور بھی وہبی نہیں بلکہ مشاہداتی تجربے کا عکس ہے۔

پانچویں بات جو آجکل کے تصوریت پسند سائنسی علم کا غلط استعمال کرتے ہوئے حسی تجربے کو غلط ثابت کرنے کے لیے پیش کرسکتے ہیں وہ یہ ہے ہماری آنکھوں کی ساخت ایسی ہے کہ یہ ایک خاص طول موج رکھنے والی روشنی میں دیکھنے کے قابل ہے اس طول موج کی رینج سے زیادہ یا کم روشنی میں نہیں دیکھ سکتی۔ یہ ماضی کے زمانے کی دلیل ہے اب ایسے آلات اور کیمرے ایجاد ہو چکے ہیں جو ہر طول موج کی روشنی میں دیکھنے کے قابل ہیں یہاں تک کہ سمندر کی تہہ تک میں دیکھ لیتے ہیں۔

حسی تجربے سے حاصل علم ہی تمام تر سائنسوں کی بنیاد ہے۔ حسی تجربے سے حاصل ہونے والا علم ایسا سچ ہے جو ہر انسان کی دسترس میں ہے ہر انسان کی سمجھ میں آتا ہے۔ ہر انسان کو آسانی سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ اسی علم نے انسان کو تسخیر مادہ کے قابل بنایا۔ حسی تجربے کی بنیاد پر کھڑی سائنس کی عمارت کا فراہم کردہ یہی وہ علم ہے جس نے انسان کو مادے پر قادر بنایا۔ انسان کو اس علم نے اتنی طاقت بخشی کہ وہ فضاؤں، سمندروں اور خلا پر حکمرانی کرے۔ یہ علم وہ ہے جس کی تصدیق اس کو استعمال کرنے سے کی جا سکتی ہے۔ سچائی کا معیار اس کے استعمال سے تجربے کے ذریعے۔ اس کے برعکس جو دنیا ہی ماورائے حس ہے۔ کوئی انسان نہ اسے دیکھ سکتا ہے نہ محسوس کرسکتا ہے۔ اس کے بارے میں صدیوں کے بعد کروڑوں لوگوں میں سے کوئی ایک معلومات فراہم کرتا ہے۔ یہ علم کسی مقدس ہستی، فلسفی یا کسی اتھارٹی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اس اتھارٹی کی فراہم کردہ معلومات کی تصدیق ممکن نہیں۔ آپ کو ایسے قیاسات، من گھڑت پہیلیوں اور فرضی کہانیوں کا اس لیے یقین کرنا پڑتا ہے کہ وہ ہستی آپکی نظروں میں کمال ہستی ہے۔ پھر ماورائے حس عقل سے علم

حاصل کرنے کا دعویٰ کرنے والے کسی ایک کی معلومات ایسا دعویٰ کرنے والے کسی دوسرے کی معلومات سے نہیں ملتی۔ایسی کامل ہستی کی بات پر یقین دلانے کے لیے اس ہستی سے ایسے معجزے جوڑے جاتے ہیں جس سے اس کی تقدیس بیان ہو۔اس ہستی کی باتوں پر یقین دلانے کے لیے ڈرایا جاتا ہے کہ فلاں نے یقین نہیں کیا تو اس کا نقصان ہوگیا۔سب سے بڑھ کر یہ کہ حسی تجربے ہی کو فریب ثابت کیا جاتا ہے جو انسان کے بیرونی دنیا سے رابطے کا واحد ذریعہ ہیں کوئی بھی خواب یا وجدانی انکشاف انسان کے حسی تجربے اور مشاہدے کے دائرے سے باہر نہیں ہوسکتا۔

افلاطون کے نزدیک عالم امثال میں دیکھی ہوئی چیزوں کی یادداشت کا واپس آنا علم ہے کائنات ایک عقلیاتی کل ہے جس کی حقیقت کا ادراک صرف عقل استدلالی یا ماورائے حس وہ عقل کرسکتی ہے جو کائناتی عقل کا جزو ہے یا فلسفی اس کا ادراک کرسکتے ہیں۔تصوریت کے فکری نظام میں علم مکمل واکمل شکل میں پہلے ہی دن سے روح کو ودیعت کردیا جاتا ہے۔یہ مکمل وکامل علم انسان کے سینے میں محفوظ ہوتا ہے۔تصوریت کے مذہبی اظہار میں سینے میں مقفل علم کو چند دعاؤں یا کچھ ریاضت سے کھولا جاسکتا ہے۔پھر جو چاہے پوچھو کائنات کا ہر راز اس میں موجود ہے۔

جب یہ علم محسوسات سے بالاتر ہے تو ایسے علم کی سچائی کا معیار کیا ہے؟کس پیمانے پر اس علم کی سچائی کو پرکھا جائے؟تو ان کا جواب یہ ہے کہ ایسا علم دینے والی صاحب کمال ہستی کا کردار ہی ایسے علم کی سچائی کی تصدیق ہے کہ کیا علم دینے والی صاحب کمال ہستی نے کبھی زندگی میں جھوٹ تو نہیں بولا ،امانت میں خیانت تو نہیں کی، پاکیزہ زندگی گزاری ہے تو ایسی ہستی کے بتائے ہوئے کائناتی راز درست ہیں اور چونکہ علم عام آدمی کی دسترس سے باہر ہے ایسے علم کو ناقص حواس کے ذریعے تصدیق کے عمل سے گزارنا ممکن نہیں اس لیے عام انسان ایسی صاحب کمال ہستی کی پیروی کرنے کا پابند ہے

تصوریت کے علم کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ علم ہر انسان کی دسترس سے باہر ہے یہ بذریعہ کسی اتھارٹی کے حاصل ہوتا ہے جو فلسفیانہ تصوریت میں فلسفی کی اتھارٹی ہے اور مذہبی تصوریت میں کامل واکمل ہستی۔اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ علم مکمل وکامل ہے ابتداء سے انتہا تک زمان ومکان کی قید سے آزاد کسی اتھارٹی کو ایک ہی بار حاصل ہوجاتا ہے۔ایسے علم کی تصدیق کہ یہ سچا ہے علم کے مندرجات یا مواد نہیں بلکہ ایسا علم فراہم کرنے والی ہستی کا ذاتی کردار ہے۔

جبکہ علم کے مادی نظریے میں ہم نے دیکھا تھا کہ علم کبھی مکمل نہیں ہوتا۔علم فطرت اور مادے پر پیداواری عمل کے دوران پیدا ہوتا ہے۔بتدریج بڑھتا ہے ارتقا پذیر ہے ایک وقت تک کی دریافتیں آنے والی نسلوں کے لیے مواد فراہم کرتی ہیں جس کی بنیاد پر اگلی نسل اس کو آگے بڑھاتی ہے۔حسی تجربہ ہی علم کی واحد بنیاد ہے۔ایسے علم کی تصدیق انسان کو فطرت کا آقا بنانے کے لیے اس کا ٹیکنالوجی میں استعمال ہے۔ان کے نزدیک علم کبھی مکمل نہ ہوا ہے نہ ہوسکتا ہے جوں جوں انسان فطرت یا مادے کی تسخیر کرتا جائے گا علم بڑھتا چلا جائے گا۔ارتقا پذیر کو ناقص خیال کرنا اور جامد کو مکمل واکمل تسلیم کرنا تصوریت کی تعمیر میں پوشیدہ ہے۔تصوریت کی فکری ساخت رکھنے والوں کے نزدیک علم جب ایک بار مکمل ہوگیا تو ہمیشہ کے لیے مکمل ہوگیا اس میں کمی یا زیادتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

علم کی معروضیت اوموضوعیت

تصوریت کی فکری تعمیر میں علم کی مجمدا کملیت کے علاوہ دوسرا پوشیدہ رجحان علم کی موضوعیت ہے۔موضوعی کا لفظ وضع سے نکلا ہے۔جس کا مطلب ہے بنانا۔تخلیق کرنا۔اپنی طرف سے کوئی رائے قائم کرنا۔خودساختہ اور من گھڑت بھی وضع کے معنوں میں آتے ہیں۔قیاس بھی ہمیشہ آپ کی اپنی طرف سے قائم کی ہوئی رائے ہوتی ہے۔

اس کو ہم ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔آپ گھر کے کسی خفیہ گوشے سے لکڑی کے ایک صندوق میں کوئی چیز رکھ کر باہر لوگوں کے درمیان لے آتے ہیں۔یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آپ کو صندوق میں کچھ رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔آپ ان لوگوں سے سوال کرتے ہیں کہ بتاؤ اس صندوق میں کیا ہے؟ صندوق میں جو کچھ ہے یہ ان لوگوں کے لیے راز ہے۔ہر شخص اپنے طور پر اس راز کو جاننے کی کوشش میں اپنے قیاس کے گھوڑے دوڑاتا ہے اور اپنی اپنی رائے قائم کر لیتا ہے کوئی کہتا ہے اس صندوق میں کپڑے ہیں۔کسی نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اس میں کتابیں ہیں کسی تیسرے نے اس میں بچوں کے کھلونے ہونے کا اندازہ لگایا ہے۔کوئی کہتا ہے اس میں مستری کے اوزار ہیں۔اگر آپ کے گرد آٹھ لوگ ہیں تو آٹھ ہی کے پاس اس کا الگ الگ جواب ہوگا۔ان میں سے ایک یا دو آپس میں کسی ایک چیز پر متفق بھی ہوسکتے ہیں۔

ان میں سے ہر شخص اپنے قیاس اور وجدان کے مطابق کسی ایسی چیز کا نام لے گا جو صندوق کے حجم میں پوری آسکتی ہے کوئی بھی یہ نہیں کہے گا کہ اس صندوق میں ریلوے انجن ہے۔کیونکہ ان کے اپنے حسی تجربے اور مشاہدے نے دکھایا ہے کہ ریلوے انجن صندوق میں پورا نہیں آسکتا۔اب آپ صندوق کا تالا کھول کر سب کو دکھا دیجئے کہ صندوق میں کیا ہے؟ آپ نے اس میں لیپ ٹاپ

رکھا تھا۔سب نے دیکھ لیا کہ صندوق میں لیپ ٹاپ ہے۔اس مشاہدے یا حسی تجربے کے بعد سب لوگ متفق ہوگئے کہ صندوق میں لیپ ٹاپ ہے۔

صندوق کا ڈھکن کھولنے سے پہلے اس راز کو جاننے کے لیے کہ صندوق میں کیا ہے ہر ایک نے اپنی طرف سے الگ الگ رائے قائم کی تھی یہ ان کی موضوعی سوچ تھی۔صندوق کے ڈھکن کھلنے کے بعد سب نے دیکھ لیا۔اس راز کو جان لیا کہ اس میں لیپ ٹاپ ہے یہ ان کی معروضی سوچ ہے۔

مادی کائنات بھی انسان کے لیے ایک راز تھی اس کو لوگوں نے دو طریقوں سے جاننے کی کوشش کی۔ایک طریقہ حسی تجربے یا مشاہدے کا تھا جس نے سائنس کو جنم دیا۔سائنس کا علم معروضی علم ہے۔نیوٹن کے قوانین پر کبھی لڑائیاں اور جنگیں نہیں ہوئیں کیونکہ وہ مادی چیزوں کی حرکت کے مشاہدے سے اخذ کیے ہوئے قوانین ہیں۔

قیاس ہمیشہ لوگوں کو تقسیم کرتا ہے۔مابعد الطبیعاتی دعوؤں کا مشاہدہ نہ مدعی نے خود کیا ہوتا ہے نہ کسی کو کروا سکتا ہے۔تو پھر ایسے دعوؤں پر یقین دلانے کا طریقہ کیا ہے؟

وہ ہے مدعی کی شخصیت کا با کردار ہونا اور جن کے سامنے مابعد الطبیعاتی دعویٰ پیش کیا گیا ہے ان کا غیب پر ایمان ہونا۔کائنات کے رازوں کو جاننے کے تصوراتی، قیاسی اور ماورائی طریقہ نے مذاہب کو جنم دیا۔مذاہب یا مابعد الطبیعات موضوعی علم ہیں۔

انسانی فکر کی تاریخ گواہ ہے کہ کسی فلسفی کی اتھارٹی یا ایمان بالغیب پر قائم تصوریت کا ایک فکری ڈھانچہ انہی بنیادوں پر قائم کسی دوسرے فکری نظام سے کبھی متفق نہیں ہوا۔حقیقت مطلقہ کی تلاش میں تصوریت یا مابعد الطبیعات کی ساری عمارت جن آراء پر تعمیر کی گئی ہے لحہ موجود تک وہ محض قیاسات اور مفروضے ہی ثابت ہوئے۔ایسی تمام آراء موضوعی ہوتی ہیں قابل مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے مجمد ہو کر عقیدہ بن جاتی ہیں۔موضوعی علم کبھی علم ہونے کی سند حاصل نہیں کر پایا اس وجہ سے موضوعی خیالات ذاتی پسند ناپسند کی طرح ہمیشہ داخلی ہوتے ہیں اور آپ کے جذبات کے تابع رہتے ہیں نہ کہ عقل کے۔

پاکستان کے مادیت پسند فلسفی سعید ابراہیم موضوعی فکری ساخت رکھنے والے ذہن کے متعلق کہتے ہیں کہ ایسا ذہن معلوم کو مسلسل شک کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتا ہے اور نامعلوم کو معلوم ثابت کرنے کی بے کار کاوش میں لگا رہتا ہے۔

موضوعیت آشنا ذہن داخلیت سے سوچنے والا دماغ اور مابعد الطبیعاتی فکری ساخت میں پروان چڑھی ہوئی عقل رکھنے والے لوگ فطری سائنسی علوم اور سماجی سائنسوں جیسے سیاسیات معاشیات، تاریخ، فلسفہ اور سماجیات کے بارے میں اپنی پسندیدہ معلومات کو عقیدہ بنا لیتے ہیں کسی رائے کو عقیدہ بنا لینے سے تجسس اور تحقیق کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ عقیدہ کسی موضوعی اور منجمد رائے کو کہتے ہیں۔ موضوعیت فکری جمود کا باعث بنتی ہے۔

پاکستانی معاشرے کو نظام تعلیم، میڈیا اور بنیاد پرست ریاستی آئیڈیالوجی کے نام پر منجمد کر رکھا ہے ایسا فکری انجماد حکمران طبقے کو دوام بخشتا ہے موضوعی آراء رکھنے والی قوم اپنے بنے بنائے نظریات کی تائید کرنے والی باتوں کو علم اور بنے بنائے نظریات سے اختلاف کرنے والوں کو جاہل سمجھتی رہتی ہے۔

ایسی شخصیات جن کے خیالات اس کی موضوعیت کے لیے تسکین کا سامان مہیا کرتی ہیں ان کو مقدس ہستیاں بنا لیتا ہے اور ایسے فلسفی، سائنسدان یا عالم جو اس کی موضوعیت کے لیے باعث آزار بنتے ہیں ان کے لیے تعصب کے جذبات رکھتا ہے، موضوعیت پسند کی عقل تو جامد رہتی ہے مگر اس کے جذبات متحرک رہتے ہیں وہ تمام فیصلے عقل کی بجائے جذبات سے کرتا ہے اس کی فکری زندگی عقیدت اور تعصب کے جذبات کے تابع رہتی ہے۔

پاکستانی قوم کی موضوعیت پسندی کا نتیجہ یہ کہ ہم تاریخ سے کوئی سبق سیکھنے کی بجائے اسے عقیدہ بنا کر رکھتے ہیں۔ تاریخ جو سماجی علوم کی ماں ہے ہمارے تعصبات کی پرورش کی فکری غذا ہے یہاں تک کہ تحریک پاکستان ایک عقیدہ اور اس سے متعلقہ شخصیات مقدس ہستیاں بن گئی ہیں تصوریت جب مذہب کے غلاف میں لپیٹ دی جاتی ہے تو وہ کوئی رائے، خیال یا فلسفہ نہیں رہ جاتی بلکہ مقدس عقیدہ بن جاتی ہے۔

موضوعی علم مکمل ہوتا ہے اس میں آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ معروضی علم اپنے کسی بھی خیال یا دریافت کو آخری اور حتمی سچائی نہیں سمجھتا۔ اس کو مزید تحقیق کے لیے اگلی نسلوں کے سپرد کرتا ہے۔

علم ایک ارتقائی عمل ہے جبکہ عقیدہ مکمل، داخلی اور منجمد خیالات کا نام ہے۔ ہیگل نے تصوریت اور مذہب کی راہیں یہ کہہ کر جدا کر دیں کہ فکر اور خیالات بھی ارتقا کے عمل سے گزرتے ہیں۔

اینگلز نے ہیگل کے تصوراتی فلسفے کی اہمیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سچائی جسکا ادراک فلسفے کا کام تھا۔ ہیگل کے ہاتھ میں تکمیل یافتہ ادعائی بیانیوں کا مجموعہ نہیں رہ گئی جو ایک بار دریافت ہو جائیں تو پھر انہیں زبانی یاد کر لیا جائے۔ سچائی اب خود ادراک کے عمل میں سائنس کے طویل تاریخی ارتقا میں مضمر ہو گئی جو علم کی نچلی سے بلند اور بلند تر سطح تک جاتی ہے۔ نام نہاد مطلق سچائی کی دریافت کر کے کسی ایک نقطے پر پہنچے بغیر جس سے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ جہاں اسے اور کچھ کرنے کو نہ رہ جائے سوائے اس کے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے جو مطلق سچائی اس نے حاصل کر لی ہے اس کو حیرت سے تکتی رہے۔

(لوڈویگ فیور باخ اور جرمن فلسفے کا خاتمہ)

تصوریت کے کلاسیکی نظریے میں علم کو مکمل واکمل اور جامد سمجھا جاتا تھا ہیگل نے خیالات کے جدلیاتی عمل سے آگے بڑھنے اور ارتقا پذیر ہونے کی دریافت سے تصوریت پسندی کا جمود توڑ دیا۔

کیا فلسفہ مشکل ہے

آپ اپنے اردگرد کسی بھی پڑھے لکھے شخص سے فلسفے کا ذکر چھیڑ لیں وہ فوری اپنے چہرے کے تاثرات سے ایسا ردعمل ظاہر کرے گا کہ جیسے آپ نے اس کے سر پر کوئی بھاری چیز رکھ دی ہو اور وہ اس بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے فوری اس کو زمین پر پٹخ کر سکھ کا سانس لے گا۔ کیونکہ یہ تاثر عام ہے کہ فلسفہ سمجھ میں نہ آنے والی، گنجلک زندگی سے کٹی ہوئی اور معنویت سے خالی باتوں کا نام ہے۔

تصوریت کے فکری رجحانات میں پروان چڑھائے گئے ہمارے معاشرے جیسے معاشروں میں عقیدوں کی شکل میں آسانی سے سمجھ میں آجانے والے جوابات سے مطمئن ہوجانے کے عادی ذہن پیدا کئے جاتے ہیں۔ یہ تھوڑے سے تردد سے سمجھ میں آنے والی بات پر غور کرنے پر ذہن کو آمادہ ہی نہیں کر پاتے۔ صدیوں پرانے ریڈی میڈ جوابات ہی سے جدید دنیا کے چیلنج سے نمٹنا چاہتے ہیں۔ جس معاشرے کی بڑی آبادی کو یہ زعم ہو کہ پڑھ لکھ کر بندہ پاگل ہو جاتا ہے تو اسکی ایک وجہ یہ ہے ایسے تصوریت پسند معاشرے میں عقل کی بات صرف اس صورت میں قابل قبول ہے کہ وہ عقیدے کی غلامی میں ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو۔ اس عمومی رجحان کی وجہ سے پاکستان کے تعلیمی اداروں میں تحقیق کا رجحان زوال پذیر ہے۔ ہماری اس فکری پسماندگی کی وجہ سے تخلیقی ذہن پیدا نہیں ہوتے۔ عقیدے کو علم سمجھ لینے کی خود فریبی کی وجہ سے ہم اتنے سہل انگار ہو جاتے ہیں کہ دینیات کے علاوہ معاشیات، سیاسیات، عمرانیات اور فطری سائنسوں کے نظریات کے صارف بن گئے ہوتے ہیں۔

فلسفیانہ سچائیوں کی پیش کاری اور مابعدالطبیعاتی سچائیوں کی پیش کاری میں بھی فرق ہے۔

اس فرق کو سمجھنے ہی سے ہم سمجھ پائیں گے کہ کیا فلسفہ مشکل ہے؟

فلسفہ مادی کائنات، معاشرے اور فکر کے وجود اور اس کی ساخت کو سمجھنے اور ان کے وجود میں حرکت وتبدیلی کو ان کی ساخت میں تلاش کرنے کی جستجو سے شروع ہوا تھا۔ جستجو کے سفر کی ایک منزل پر یہ خارجی دنیا کی حرکت اور فکر کے ارتقا کے عام قوانین کی دریافت کا باعث بنا۔ پھر سائنسی ترقی نے مادی کائنات اور معاشرے کے وجود میں متضاد قوتوں کے اتحاد اور ان کے درمیان ٹکراؤ کی دریافت کو ان میں حرکت وتبدیلی کی وجہ کے طور پر پہچانا۔ تلاش کے اس سفر میں فطری اور سماجی سائنسوں کے علوم کے انبار لگا دیئے اور لمحہ موجود تک آتے آتے کائنات و مافیہا کو غیر موقوف تاریخی ارتقا سے گزرتے ہوئے مادے کی حیثیت سے جاننے کے قابل ہو گئے جسے جدلی مادیت کہتے ہیں۔ کھوج کے اس سفر میں انسان پر منکشف ہونے والی قابل تصدیق سچائیاں ہی فلسفیانہ یا سائنسی سچائیاں ہیں۔

ایسی سچائیوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ بڑی آسانی سے انسان کی سمجھ میں آجانے والی ہوتی ہیں اور ایسی سچائیوں کا حامل اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی سمجھا سکے۔ ایسی سچائیوں کو عام فہم زبان میں بیان کیا جاتا ہے تاکہ وہ زندگی کو آگے بڑھانے کے لیے درکار علم سے لیس ہو کر عملی زندگی میں ٹھیک نتائج پیدا کرنے کے قابل وہ جائے۔ ان سچائیوں کو علم کہتے ہیں۔

اس کے برعکس تصوریت کا آغاز بھی تلاش حقیقت ہی سے ہوا تھا۔ مگر اسکی بنیاد ایسی حقیقت کی تلاش تھی جس کو مادی کائنات اور معاشرے سے باہر فرض کر لیا گیا تھا۔ جو مادی کائنات اور معاشرے کو بیرونی عامل کی حیثیت سے چلا رہی تھی۔ ایسی حقیقت جو ماوراء ہے جس کو سمجھنے سے پہلے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انسانی عقل ناقص ہے اس کو سمجھنے کی استطاعت نہیں رکھتی اس کو سمجھنے کے لیے غیب پر ایمان ضروری ہے۔ کیونکہ انہیں تصدیق کے عمل سے نہیں گزارا جا سکتا انہیں مابعد الطبیعاتی سچائیوں کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر یہ مابعدالطبیعاتی سچائیاں فلسفے کی زبان میں بیان کی جائیں تو اس اتھارٹی کے کامل ہونے پر یقین ہونا لازمی ہے جس نے یہ بیان کی ہیں۔ اور اگر ان کو مذہب کے غلاف میں پیش کیا جائے تو ان مابعدالطبیعاتی سچائیوں کو عقیدے کے طور پر مان لیا جائے۔ جب کہ فلسفہ کے نزدیک کوئی بھی ایسا تصور جو مافوق الفطرت دنیا کے بارے میں ہو اس کے بارے میں کوئی بھی دعویٰ محض قیاس ہے۔ مابعد الطبیعات کی ساری کہانی تشریحات اور

تاویلات کے زور پر چلتی ہے۔ تمثیل، قصے اور کہانیاں ان کے اظہار کے ذرائع ہیں۔ شاعری سے جذبات کو ان کا طرفدار بنایا جاتا ہے۔ انہیں ایسے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے جو آپ کی سمجھ سے بالا تر ہوں تاکہ آپ کو یقین آ جائے کہ آپ کی عقل واقعی ناقص ہے۔ مثال کے لیے جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبہ فلسفہ ڈاکٹر میر ولی الدین کی کتاب سے ایک نمونہ پیش خدمت ہے۔ کہنا آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ دنیا ''کن'' سے کیسے وجود میں آئی۔ فرماتے ہیں ''اسم علیم اسماء پر حاکم ہے اور تمام عوالم کا اس پر مدار ہے۔ بصیر کے ذریعے تمام علوم الہیہ (اعیان ثابتہ) ممتاز ہوتے ہیں۔ یا یوں کہو کہ علم خاص متعلق ہوتا ہے۔ سمیع کے ذریعے اعیان ثابتہ کے اقتضاءات کا علم ہوتا ہے۔ قدیر کے ذریعے قدرت بطور کلی اعیان کو وجود عطا کرتی ہے۔ مرید کے ذریعے قدرت بطور کلی اعیان کو وجود عطا کرنے اور ان کے اقتضاءات و شاکلات کو نمودار کرنے کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ کلیم اعیان ثابتہ کو کن سے خطاب فرماتا ہے اور وہ خلعت وجود سے مشرف ہو جاتے ہیں۔''

اس طرح ابہامات کے دلدل میں اور حیرتوں کے بھنور میں پھنسے ہوئے اگر آپ اپنے آپ کو بے بس محسوس کریں اور اس حالت میں آپ سے کوئی بات منوالی جائے کہ یہ سچائی ہے تو ایسا ماننا علم کسی صورت بھی نہیں کہلا سکتا اس پر مستزاد یہ کہ اس کو فلسفہ کہنا اس سے بڑا ظلم ہے۔

یہ مابعدالطبیعات، ماورائیت اور تصوریت ہے جو انسان کو زندگی اور زندگی کے ہنگاموں سے کاٹ کر کسی خیالی، فرضی دنیا سے جوڑ کر رکھتی ہے۔ جو اپنے عدم ابلاغ کی کمزوری کی وجہ سے ابہامات کے ذریعے جہالت، خوف، بے معنویت اور فرار کے دروازے کھولتی ہے۔

اس کے برعکس فلسفہ لوگوں کو سادہ اور آسان زبان میں اسباب اور حقیقی وجوہات سے روشناس کرنے کا ذریعہ ہے۔ ان اسباب سے روشناس کرنے کا مقصد عام انسان میں یہ اعتماد پیدا کرنا ہوتا ہے کہ وہ کائنات کا مالک اور فطرت کا آقا ہونے کی نسبت سے زندگی میں مثبت نتائج پیدا کرنے اور زندگی کو آگے بڑھانے کا ذمہ دار ہے۔ کائنات کا کوئی راز ایسا نہیں جو انسان کی دسترس سے باہر ہو اور کائنات کی کوئی مشکل ایسی نہیں جس کو حل کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہے۔

فلسفہ کی مشکل الفاظ میں پیش کاری کا ایک طبقاتی کردار بھی ہے۔ فلسفہ کو مشکل بنا کر پیش کرنے سے عام لوگوں کو کائنات اور سماج کی گتھیاں سلجھانے والے علم سے محروم رکھا جاتا ہے مابعدالطبیعات کے عقل کو ماؤف کرنے کی نیت سے گھڑے گئے قیاسات کو فلسفہ کے نام

پر متعارف کروانے کا ایک فائدہ حکمران طبقے کو یہ ہوتا ہے کہ عام لوگ اپنی غلامی، پسماندگی اپنے اوپر ہونے والے جبر و استحصال کے اسباب کو مافوق سے جوڑ لیتا ہے جو اس کے زمینی اسباب کو سمجھنے سے پھسلا دیا جاتا ہے۔ زندگی میں بہتری، مثبت نتائج اور انصاف کی امید بھی مافوق سے وابستہ کر لیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں معاشرے کو انسانوں کی اجتماعی کوشش سے بدلنے کے ارادے کے پیدا ہونے کا ممکنہ خطرہ ٹل جاتا ہے جو حکمران طبقے کے تحفظ کی ضمانت بن جاتا ہے۔

عام انسان کو مابعدالطبیعات کی بھول بھلیوں اور مشکل بیانات کے گورکھ دھندے میں پھنسا کر انہیں یہ یقین دلانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ وہ کم تر اور کند ذہن لوگ ہیں وہ جب ایسی سچائیوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے وہ کیا کر لیں گے؟ یہ باتیں اعلیٰ اور نفیس دماغوں کی سمجھ میں آتی ہیں لہٰذا ایسے بے بس اور مجبور لوگوں کے لیے نجات کا راستہ یہی ہے کہ وہ خود کو کسی نفیس اور اعلیٰ دماغ کی سپردگی میں دے دیں۔ مابعدالطبیعات چونکہ گورکھ دھندہ ہے اس پر فلسفے کا لیبل لگا کر فلسفے کے مشکل ہونے کا تاثر دینا عام آدمی کو کائنات اور سماج کو سمجھنے سے دور رکھنا ہے۔

فلسفوں کا طبقاتی کردار

صدیوں سے سوچی جانے والی انسانی سوچ، ظاہری طور پر خواہ ہزاروں مختلف شعبوں میں بٹی ہوئی نظر آئے حقیقت میں صرف دو ہی فکری سرچشموں سے پھوٹتی ہے۔ ایک کو مادیت اور دوسرے سرچشمے کو مابعد الطبیعات کہتے ہیں۔ فکر کا کوئی تیسرا دھارا جو ان دونوں فکری سرچشموں کے علاوہ اپنا الگ وجود رکھتا ہو لمحہ موجود تک تو وجود میں نہیں آیا۔ اب تک کے موجود تمام تر علوم اور عقائد یا تو مادیت کے فکری دھارے سے پھوٹے ہیں یا پھر مابعد الطبیعات نے انہیں جنم دیا ہے۔

1۔ ہماری زمین ہو یا مادی کائنات، انسان ہو یا معاشرہ، مادی وجود رکھنے والی کسی بھی شے میں حرکت وتبدیلی کی وجوہات کو مشاہداتی عمل کے ذریعے اس شے کی ساخت میں تلاش کرنے کو مادیت کہتے ہیں۔ مشاہداتی عمل سے اخذ کردہ نتیجہ قابل تصدیق ہوتا ہے کیونکہ مادئین کے نزدیک سچائی ایک خارجی حقیقت ہے اور ہر انسان کی دسترس میں ہے۔ تمام تر فطری اور سماجی سائنس مادیت کے شجر کے پھل پھول ہیں۔

2۔ ہماری زمین ہو یا کائنات، انسان ہو یا معاشرہ۔ مادی وجود رکھنے والی ہر شے میں حرکت وتبدیلی کے اسباب کو اس شے کے وجود کے باہر، مافوق اور عالم غیب سے منسوب کرنے کو مابعد الطبیعات کہتے ہیں۔ ایسی حرکت وتبدیلی کسی خیال یا تصور یا تصوراتی وجود کے اس پر اثر انداز ہونے کا نتیجہ فرض کی جاتی ہے۔ اس کو محض عقیدہ کے طور پر درست تسلیم کیا جاتا ہے۔ مذاہب، پامسٹری، علم النجوم، تعویز اور جادو مابعد الطبیعات کے فکری دھارے کی پیداوار ہیں۔

ہر نظریہ، ہر فلسفہ، ہر علم، ہر قسم کی شاعری، ادب وفن کسی نہ کسی طبقے کے مفادات کی پہرے داری کر رہے ہوتے ہیں۔ ہر فلسفہ وفکر کسی نہ کسی طبقے کے مفادات کا نگران ہوتا ہے۔ مادیت اور مابعد الطبیعات کے فکری دھاروں کا کردار بھی ابتدا ہی سے طبقاتی رہا ہے مادیت ہمیشہ سے عام آدمی

جبکہ مابعد الطبیعات ہمیشہ سے بالا دست اور حکمران طبقوں کے کام آتی رہی ہے۔ انسانی تاریخ میں طبقاتی لڑائی کا فکری اظہار ہمیشہ مادیت اور مابعد الطبیعات کے درمیان چپقلش کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔

ابتدائی انسان کو بتایا جاتا تھا کہ دیوتا کس طرح انسانی زندگی میں دخل انداز ہوتے ہیں۔ کن باتوں اور اعمال سے خوش ہو کر انسان کو انعام و کرام سے نوازتے ہیں اور کن کن باتوں پر ناراضگی اور غیض وغضب کا اظہار کرتے ہیں۔ پھر کس طرح ان کو راضی کیا جا سکتا ہے۔ کس کس کی غلامی کرنے اور کیا کیا بھینٹ دینے سے ان کی ناراضگی سے بچا جا سکتا ہے۔

یہ زراعت کا دور تھا اور بیج بونے سے لے کر فصل پک کر تیار ہونے تک کے لیے انسان کو بہت سی رسمیں ادا کرنی پڑتی تھیں۔ ان رسموں کے ادا کرنے میں رہنمائی کرنے پر مذہبی پیشوا اور ریاست کو ٹیکس ادا کرنے کے بعد کسان اپنی سال بھر کی محنت کا پھل وصول کر پاتا تھا۔

انسان کی طاقت سماج تھا۔ وہ ملکر قدرت کی مخالف قوتوں کے ساتھ لڑتا۔ مشترکہ محنت کے ذریعے علم اور تجربہ حاصل کرتا۔ مشاہدے کے اسلوب نے انہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ اسباب دریافت کریں۔ اسباب کو کام میں لا کر فطرت پر غلبہ حاصل کریں اور اس کے آقا بن جائیں۔ اب کسان اعتماد کے ساتھ کھیت جوتتا ہے اور جانتا ہے کہ اچھی یا بری فصل کا دارومدار خود اس پر ہے۔ اس کی مدد کے لیے بہت سی مشینیں اور کھادیں ہیں۔ اس نے زیادہ پیداوار دینے والا بیج ایجاد کر لیا ہے۔ زرعی سائنس نے نہ صرف پیداوار میں اضافہ کیا ہے بلکہ ہر موسم میں ہر فصل لانا ممکن بنا دیا ہے۔ بیماریوں کو آسمان سے اتری ہوئی سمجھا جاتا تھا اس کے فطری اسباب کو جاننے کی طرف رجوع نہیں تھا۔ اب خون کے ایک قطرے میں سرخ اور سفید جسموں کی تعداد اور مختلف عناصر کی مقدار کا حساب تک انسان کی دسترس میں ہے مابعد الطبیعات پر اعتقاد نے انسان کو بے بس ہونے کا یقین دلا دیا تھا۔ اسے مسلسل ایک انجانے خوف میں مبتلا کر رکھا تھا، بے بسی اور خوف اسے پناہ ڈھونڈنے پر مجبور کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ جلد ہی ذہنی اور جسمانی غلامی قبول کرنے پر تیار ہو جاتا تھا۔ فطرت کے سامنے بے بس اور لاچار انسان زندگی کے نشیب وفراز کو قدرت کی منشا سمجھ کر قبول کر لیتا تھا۔ اس طرح حکمران طبقہ مذہبی پیشوا کے ذریعے عام آدمی کو زندگی کے بے معنی ہونے کے حصار میں بند کر دیتا تھا۔ علم انسان کے مابعد الطبیعاتی وہموں کے ساتھ لڑا۔ انسان کی بے بسی کے حصار کو توڑا۔ اس میں اعتماد پیدا کیا۔ نہ صرف فطرت کو اپنے بس میں کیا بلکہ سماجی نظام کی ناہمواریوں کو ختم کرنے پر بھی قدرت حاصل کی۔ عالمی شہرت یافتہ سائنسدان اور

لکھاری جے ڈی برنال نے فلسفوں کے طبقاتی کردار پر بحث کی ہے۔ان کے مطابق۔

"جب سماج میں مختلف طبقے وجود میں آئے۔مختلف سوچ کے حامل افراد کی وابستگی بھی مختلف طبقوں سے رہی ہے۔دنیا کو مثالی تصوراتی خیال کرنے والوں میں اہل ثروت، حکمران اور مروج مذہب کے پرستار شامل رہے ہیں۔جو مروج سوچ اور نظام میں ذرا بھر تبدیلی بھی برداشت نہیں کرتے ان کا سب سے بڑا سرخیل افلاطون تھا۔اس کے خیال میں علم کا مقصد صرف یہ وضاحت کرنا ہے کہ چیزوں کی موجودہ شکل ایسی کیوں ہے اور یہ کہ ان کے طریق اور شکل میں تبدیل لانا نہ صرف ناممکن ہے بلکہ ایک ناپاک جسارت ہے۔اس کے ذہن کے مطابق بس کہیں کہیں سے کچھ "داغ" دور کرنے کی ضرورت ہے۔مثلاً جمہوریتوں میں سے عوام کی شرکت ختم کر دینی چاہیے تاکہ ریاست کا نظام اس کی محافظ اور سرپرست "بڑی ہستیوں" کے زیر نگرانی اور ابد تک پرامن طور پر چلتا رہے۔کیونکہ ان معاملات کی بلندی کی سمجھ ادنیٰ درجے کے لوگوں کو نہیں آ سکتی۔اس لیے ان پر یہ ثابت کرنا ضرور ہے کہ مادی دنیا محض ایک وہم ہے اور اس میں پائی جانے والی برائیاں بھی غیر حقیقی شے ہیں۔اس مثالی تصور میں اور دنیا میں کوئی تبدیلی لانا بھی بدی میں شامل ہے۔ بلاشبہ چیزوں کا اصل نیکی، سچائی اور حسن لازوال ہیں۔مگر کیونکہ یہ عالم ہمیں اس دنیا میں نظر نہیں آتا اس لیے اس کی تلاش ایک مثالی جنت میں کرنی چاہیے۔(سائنس تاریخ کے آئینے میں حصہ اول)

یہ تاثر کہ یہ دنیا کسی دوسری فرضی حقیقی دنیا کی پرچھائی ہے اور آپ کی حیثیت ریموٹ کنٹرول سے چلنے والے روبوٹ سے زیادہ کچھ نہیں۔یہ مادی کائنات رام کی لیلا ہے، برہما کا خواب ہے، فانی ہے اور کسی مقررہ دن دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو جائیگی۔یہ دنیا جس فرضی حقیقی دنیا کے کنٹرول سے چل رہی ہے وہ دنیا نہ صرف آپ کی جسمانی دسترس سے باہر ہے بلکہ آپ کے حواس سے بھی ماوراء ہے۔یہاں رونما ہونے والے حادثات، واقعات اور اعمال کا آپ ایک قیدی تماشائی کی طرح صرف نظارہ کر سکتے ہیں دنیا کو ازل سے منجمد اور انسان کے ابد تک بے بس ہونے کے مابعدالطبیعات کے تصورات نے ہمیشہ غاصب، جابر اور قابض حکمران طبقات کے مفادات کی نگرانی کی ہے۔کوئی بھی ایسا شخص جو حالات سے غیر مطمئن ہو، اپنے اوپر جبر کے حالات سے ناخوش ہو، اپنی زندگی میں ہونے والی بے انصافیوں کی وجہ سے بے چین ہو، ہر وقت کے عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا رہنے کو پسند نہ کرتا ہو اور ایسے حالات پیدا کرنے والے نظام کو بدلنے کی خواہش اگر اس کے دل میں پیدا ہو جائے تو

مابعدالطبیعات کے اس خیال کا انگوٹھا آپ کی تازہ ابھرنے والی خواہش کے گلے پر رکھ کر اسے ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیتا ہے کہ قدرت کی منشا یہی ہے جتنا آپ قدرت کی منشا پر راضی ہوں گے اسے تہہ دل سے زبان پر شکایت لائے بغیر قبول کریں گے۔اتنا آپ کو موت کے بعد کی زندگی میں انعام سے نوازا جائے گا۔اگر آپ پھر بھی بضد ہیں کہ ایسا نظام تبدیل کرنا ہے جو ظلم، جبر اور بے انصافیوں کو جنم دیتا ہے تب بھی آپ کیا کر لیں گے یہ دنیا تو ایک پرچھائی ہے۔پرچھائی میں تبدیلی ناممکن ہے جب تک اس کا اصل وجود تبدیل نہ ہو جو کہ عالم بالا میں ہے، مابعدالطبیعات تبدیلی کے خواہشمند انسان کے خلاف حکمران طبقے کا موثر ترین ہتھیار ہے اس کے برعکس مادیت نے عام انسان میں یہ اعتماد پیدا کیا کہ مادہ ناقابل فنا مستقل حقیقت ہے۔مادیت نے انسان کے سامنے کائنات اور معاشرے کے تمام راز کھول کر رکھ دیئے کہ مادے کے اسباب جان کر انہیں اپنے کام میں لاؤ اور فطرت اور قدرت کے مالک بن جاؤ۔خوشحالی کے اسباب دریافت کر کے اپنے لیے خوشحالی پیدا کرو، تباہی کے اسباب دریافت کر کے تباہی سے چھٹکارا حاصل کرو۔بیماریوں کی وجوہات دریافت کر کے انسان کو تکلیفوں سے نجات دلاؤ۔انسان نہ صرف اپنے حالات کو بدل سکتا ہے بلکہ ایک ہی طرح سوچنے والے انسان مل کر معاشرے کو بھی بدل سکتے ہیں۔مادیت نے انسان کو نہ صرف خوف، بے بسی اور لاچارگی کے احساس سے نجات دلائی بلکہ اسے اس یقین سے سرشار کیا کہ اگر وہ بے جان لوہے کو راکٹ بنا کر ہوا میں اڑا سکتا ہے تو جاندار باشعور معاشرے میں تبدیلی کیوں نہیں لا سکتا؟ مادیت نے من گھڑت کہانیوں اور فرضی قصوں کے پھیلائے وہموں کو اسباب کی دریافت کے ذریعے علم میں بدل دیا، مادیت عام آدمی کا فلسفہ ہے جو نہ صرف اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ فطرت کا مالک ہے۔تبدیلیوں پر قادر ہے بلکہ اس کی تبدیلی کے میکانزم کی دریافت اور عمل میں بھی مدد کرتا ہے۔جدلی مادیت تو پھر ہے ہی انقلاب کی سائنس تاریخ کے فلسفے کے نام پر بھی حکمران طبقے نے تاریخ کے علم کے ذریعے جمودی خیالات متعارف کروائے۔تاریخی تصوریت (جس کو حسب روایت فلسفہ تاریخ ہی کیا جاتا ہے) کے مطابق تاریخ عظیم ہستیوں کی سوانح حیات کا مجموعہ ہے (کارلائل) یا تاریخ ایسے ہیروز کے کارنامے ہیں جو اپنی طاقت سے سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیاں لاتے ہیں (سپینگلر دنیا بھر کی تاریخ کو ان اقوام کے ہیرو، بادشاہوں، حکمرانوں اور فاتحین کے ادوار میں تقسیم کر کے ترتیب دیا جاتا ہے۔

پاکستان ہی کی تاریخ کو دیکھ لیں قیام سے قبل یہ خلجی، لودھی، مغل حکمرانوں کے ادوار اور قیام

پاکستان کے بعد قائداعظم، لیاقت علی، جنرل ایوب، جنرل ضیاء، بھٹو خاندان اور نواز شریف کے ادوار میں تقسیم ہے۔ انگریز کالونیل دور کو بھی ہم قائداعظم اور علامہ اقبال کے حوالے ہی سے پڑھتے ہیں۔ اس طرح ہندوستان میں تاریخ مہاتما گاندھی اور نہرو خاندان کے حوالے سے ترتیب دی جاتی ہے۔ ہیرو کو مافوق البشر قوتیں رکھنے والا، عزم و ہمت کا پیکر، دھن کا پکا۔ ناقابل شکست اور ناقابل تسخیر ہستی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ایسے من گھڑت واقعات ان ہیروز سے منسوب کیئے جاتے ہیں جو عام آدمی کے لیے معجزاتی، کرشماتی اور عام آدمی کی سکت سے بلند تر ہوتے ہیں۔ ان ہیروز کے ساتھ آسمانی تائید جوڑنے کے لیے کچھ لوگوں کو ایسے خواب آتے ہیں کہ جن سے ثابت ہوا کہ تمام مقدس ہستیاں اس ہیرو کو پشت پر ہیں۔

ریاستی سطح پر تاریخ کی تعلیم کے ذریعے اور مذہبی تاریخی واقعات کے ذریعے ہیرو پرستی کا رجحان عام آدمی کے ذہن میں راسخ کیا جاتا ہے تاکہ عام آدمی اس ہیرو کے سامنے خود کو ایک کیڑے مکوڑے کی حیثیت سے دیکھے۔

صفدر میر نے ہیرو پرستی کے رجحانات میں مضمر طبقاتی مفادات کی نشاندہی کی ہے۔ کہتے ہیں ہیرو پرستی کے رجحانات سماجی اور سیاسی سطح پر نقصان دہ ہیں کیونکہ ان کے ذریعے عوام میں جمود اور مفعولیت فروغ پاتے ہیں۔ اپنی تقدیر خود بدلنے کی بجائے وہ دیومالائی کرداروں اور نجات دہندوں کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر تاریخ میں ان لاکھوں افراد کے حقیقی کردار کی نفی کرتا ہے جن کی جدوجہد کا ذکر کیے بغیر انسانیت کے کسی باب کا تذکرہ مکمل نہیں ہوتا۔ تاریخی تصوریت میں تاریخ کو ہیرو کے زاویئے سے دکھانے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ عام آدمی کے کردار کو تاریخ کو بدلنے کے عمل میں صفر ثابت کیا جائے۔ عام آدمی میں یہ عقیدہ راسخ کیا جائے کہ وہ بے بس ہے۔ بس کچھ لوگ منشائے فطرت کے نتیجے میں اتارے جاتے ہیں جو آ کر لوگوں کے حالات بدل دیتے ہیں۔ لوگوں کو چاہیے کہ ان کا انتظار کریں کہ کب قدرت کے سینے میں لوگوں کے حالات کو بدلنے کی امنگ پیدا ہو اور وہ کوئی نجات دہندہ بھیجے، نجات دہندہ کے جانے کے بعد پھر اگلے نجات دہندہ کے آنے تک لوگ پہلے والے نجات دہندہ کی اولادوں میں وہی شکتیاں تلاش کریں کہ شاید انہیں وراثت میں مل گئی ہوں اس طرح لوگوں میں اپنے حالات میں تبدیلی لانے میں ان کے اپنے کردار کی نفی کر کے انہیں سکون کی نیند سلا دیا جاتا ہے۔ حکمران طبقے کے لیے ہر وہ نظریہ تقدس کا درجہ بھی رکھتا ہے جو ان کے طبقاتی مفادات کا نگران ہو۔ تاریخی تصوریت بھی حکمرانوں کے مفادات کا نگران نظریہ ہے۔ اس کے برعکس تاریخی مادیت کا نظریہ عام انسان کو اپنی تقدیر بدلنے کا فریضہ سونپتا ہے۔

مذاہب کا طبقاتی کردار

مارکسی سائنسی فلسفی جے، ڈی، برنال نے اپنی شہرہ عالم کتاب "سائنس، تاریخ کے آئینے میں" لکھا ہے "دنیا کی اولین تہذیبوں میں جو عظیم عالمی مذاہب ظہور پذیر ہوئے ان میں بدھ مت، زرتشت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام نے اپنے اپنے ادوار میں سماجی اور اقتصادی سطح پر تبدیلیاں پیدا کیں۔ اپنے ہم عصر معاشرے میں جمود اور روایت پرستی کو توڑا۔ طاقتور اور حکمران طبقے پر تنقید کی۔ ان پیغمبروں نے انسان کے حقوق و فرائض کے نئے ضابطے مرتب کیے ان عظیم ہستیوں نے نئی معاشرت کی بنیاد رکھی اگرچہ ان کے ضابطوں کا اظہار مذہبی اصطلاحات ہی میں کیا جاتا رہا۔ معاشرے کی نئی تشریحات یا نئے تصورات جو پر آشوب دور کی کشاکش اور جدوجہد کے دوران وجود میں آئے اپنے مضمرات کے لحاظ سے ایک نئے نظام کو مرتب کرنے اور موثر بنانے میں طاقتور ذرائع بن گئے"۔

معاشرے کے مطالعہ کا علم ایک فعال سرگرمی رہی ہے جو یا تو ایک سماجی نظام کی حفاظت کرتی ہے یا اسے تباہ کرنے کے درپے ہوتی ہے۔

دنیا کا کوئی علم، نظام فکر یا سماجی نظام کبھی ایسا نہیں رہا جس کو ترقی دینے اور بہتر بنانے کی کوئی گنجائش موجود نہ رہی ہو۔ انبیائے کرام نے یہ فریضہ بخوبی سرانجام دیا۔ وہ نہ صرف استحصالی نظام سے ٹکرائے بلکہ ایک متبادل فکر کے ذریعے جمود کو توڑنے میں کامیاب ہوئے۔ جب سے انسانی سماج طبقات میں تقسیم ہوا۔ تب ہی سے حقوق سے محروم طبقہ حقوق غصب کرنے والوں سے برسر پیکار رہا ہے۔ وسائل پیداوار پر قابض اور غاصب طبقہ اپنے نظام کی حفاظت کے لیے استحصالی ہتھکنڈوں کے علاوہ مابعد الطبیعات اور مغالطہ انگیز نظریوں کی ریاستی پشت پناہی کے ذریعے لوگوں کو اپنے حقوق سے دستبردار ہونے پر مجبور کرتا رہا ہے۔ یہ طبقاتی لڑائی دونوں طرف سے لڑی جاتی رہی ہے۔ اس طبقاتی لڑائی کا میدان شاعری، ادب، فلسفہ، مذہب اور عقائد بھی رہے ہیں۔

مذاہب پیدائشی انقلابی ہوتے ہیں اور تب تک انقلابی رہتے ہیں جب تک پسے ہوئے محروم طبقات اسے سماجی تبدیلی کے عمل سے جوڑے رکھتے ہیں۔ جب تک وہ مروجہ طبقاتی سماجی نظام میں غاصب طبقات کے خلاف صف آراء رہتے ہیں۔ اونچ نیچ کی غیر انسانی قدروں، روحانی برتری کے جھوٹے دعوؤں اور تقدیر کے نام پر محروم طبقوں کی تبدیلی کی خواہش کو دبانے کیخلاف برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ نئے خیالات اور ان کی پشت پر تازہ عقائد کے ہتھیاروں سے لیس پرانے اور فرسودہ نظام کو ڈھانے کے درپے رہتے ہیں یہ تاریخی سفر پر انسانی تہذیب کی وہ منزل تھی جب سائنسی تشریح و تجزیئے کا وجود نہ تھا۔ مادی اور سماجی تبدیلیوں کو مافوق الفطرت حوالوں سے سمجھا جاتا تھا۔

جس طرح آج کے زمانے میں سماجی تبدیلی کے عمل میں سماجی علوم کی پیدائش ہوتی ہے اس زمانے میں سماجی تبدیلی ہی کے عمل میں ایک نئی مابعد الطبیعات کی پیدائش ہوتی تھی۔ محروم طبقات اپنے وقت کے استحصالی نظام کی محافظ مابعد الطبیعات کے پھیلائے ہوئے خوف میں اس طرح مبتلا ہوتے تھے کہ سماجی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرنے اور تبدیلی کی خواہش رکھنے کے باوجود تبدیلی کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھا پاتے تھے۔ اپنے خوف پر قابو نہیں پا سکتے تھے۔ جبر و استحصال کو نظام فطرت سمجھ کر قبول کر بیٹھے ہوتے تھے۔ ایسی صورت میں پرانی مابعد الطبیعات کو کفر اور گمراہی قرار دے کر نئی الٰہیات انہیں خوف پر قابو پانے میں مدد دیتی تھی۔ روایت پرستی کا جمود توڑنے پر آمادہ کرتی تھی۔ کفار مکہ کہتے تھے کہ ہم اپنے آباؤاجداد کا دین کیسے چھوڑ دیں جو ہزاروں سال سے چلا آرہا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی ساری جدوجہد غلاموں کی آزادی پر منتج ہوئی۔ فرعون کے زمانے کی معیشت سودخوری پر اور نظام حکمرانی غلامی کے طبقاتی نظام پر قائم تھی۔ تورات کی کتاب خمسہ میں سے پانچویں کتاب جس میں غلاموں کو آزاد کرنے اور سودخوری کو محدود کرنے کی تاکید پائی جاتی ہے آسمانی احکامات کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ہمیں معاشرے کے لیے ایک ضابطہ ملتا ہے یہ ضابطہ مکمل طبقاتی حکمرانی کو کم از کم محدود کرنے کی سعی ضرور کرتا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ اگر صرف کوڑھیوں کو شفا بخشتے تھے اور مردوں کو زندہ کرتے تھے تو اس میں ریاست کا کیا نقصان تھا جس کی وجہ سے ریاست نے انہیں صلیب پر چڑھایا۔ وہ ایک مزدور کے گھر پلے بڑھے تھے انہیں ظلم اور افلاس کا ذاتی تجربہ تھا۔ اور وہ معاشرتی خرابیوں کے اسباب سے بخوبی واقف تھے۔ وہ سماجی بے انصافیوں کے خلاف نئے سماجی نظام کے لیے نئے مذہب کی

تلقین کرنے لگے۔ ان کے 12 شاگرد تھے جن میں تمام کے تمام محنت کش طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لوقا کی انجیل میں لکھا ہے ''یسوع نے ایک دولتمند کو دیکھ کر کہا کہ دولتمندوں کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے کیونکہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزر جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو''۔

اسلام تو پھر ہے ہی غلاموں کی آزادی، عورتوں اور بچوں کے حقوق کا علمبردار۔ انسانوں کی معاشی، سماجی اور روحانی برابری کا نظام، سرداران مکہ جو اپنے استحصالی نظام کو پہاڑوں کی طرح زمین میں گڑھا ہوا سمجھتے تھے انہیں روئی کی طرح اڑانے والا اخلاق خدا کا راج قائم کرنے والا مذہب اسلام ہی تھا۔

پھر ایک وقت کے بعد حکمران طبقہ نئے مذہب کو قبول کر لیتا ہے۔ اس کی سماجیات کو مابعد الطبیعات سے الگ کر کے کسی سرد خانے میں ڈال دیتا رہا ہے اور اس کی مابعد الطبیعات کو نئے معنی پہنا کر اونچ، نیچ سماجی اور معاشی بے انصافی، جبر و استحصال کے جواز کے لیے آسمانی تائید کے طور پر استعمال کرتا رہا ہے۔ حکمران طبقوں کے ہاتھ میں آکر، سماجیات سے الگ کی ہوئی الٰہیات استحصالی اور طبقاتی نظام کے جواز کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔

زرعی دور معیشت میں یہ بات جاگیرداروں اور ان کے سربراہ سلطنت کے بادشاہ کے مفاد میں رہی ہے کہ وہ اپنے طبقے کے افراد اور تابع فرمان لوگوں کے دل میں عمومی طور پر اس خیال کو جاگزیں کر دیں کہ ان کی مراعات کی حفاظت کرنے والا نظام دراصل قدرت کی منشاء ہے بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب ہو بادشاہ کو ہمیشہ خدا کی طرف سے مخلوق پر مقرر کردہ نمائندہ بتاتا رہا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سے ریاست اور مذہب کا ایک دوسرے میں ضم ہونا چلا آ رہا ہے۔ یہ مذاہب کا دوسرا دور رہا ہے جس میں مذہب کو عوام کو دبائے رکھنے اور سماجی تبدیلی کے عمل کو روکنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ 19ویں صدی میں سائنس و فلسفہ، مادی علوم کی تقلید میں معاشیات، سیاسیات اور عمرانیات کی تشکیل سرمایہ داری کی ضرورتوں کے پیش نظر کی گئی۔ سرمایہ داری نے معاشرے کو سرمایہ دار یا ذرائع پیداوار کے مالک طبقے اور جسمانی یا ذہنی محنت فروخت کر کے روزی کمانے والے مزدور طبقہ میں واضح طور پر تقسیم کر دیا، سرمایہ داری معیشت کی ضرورتوں کے مطابق سیاسی نظام کی تشکیل میں مذہب کو ریاست سے الگ کر دیا گیا۔ جب سرمایہ داری کے حق میں پیش کیے جانے والے عقلی جواز لوگوں کو قائل کرنے میں ناکام ہوگئے تو اس مقصد کے لیے

مذہب کا سہارا حاصل کیا گیا۔ اس کے لیے مافوق الفطرت جواز مہیا کیے جانے لگے۔ انقلاب فرانس کے بعد مذہب کی جانب مراجعت ارادی طور پر عمل میں لائی گئی۔ فاقہ کشی اور کفایت شعاری کے حق میں انجیلی جواز تلاش کرنے پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اس سلسلہ میں یہ کہا جاتا تھا کہ یہ اعمال حسنہ ہیں اور یہ مادی فیوض و برکات کا موجب بنتے ہیں۔ اس قسم کے خیالات کی باقاعدہ ترویج و اشاعت کے لیے ریاستی سرپرستی اور سرمایہ داروں کا پیسہ وافر مقدار میں میسر تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب دنیا دو واضح بلاک یعنی سوشلسٹ بلاک اور عالمی سرمایہ داری میں تقسیم ہوگئی تو عالمی سرمایہ داری نے سرد جنگ کے نام سے مذہب کو سوشلزم کے خلاف استعمال کرنے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی۔ مذہب کے نام پر نئی ریاستیں قائم کی گئیں۔ ایک مذہب کی بنیاد پرستی کے ردعمل نے دوسرے مذہب کی بنیاد پرستی کو ابھارا۔ لوگ اپنے معاشی سیاسی حقوق کو بھلا کر عقیدے کے دفاع میں جٹ گئے اور مخالف مذہب کے خلاف نفرت نے ان کی عقل پر قبضہ کر لیا۔ ریاستی سطح پر بنیاد پرستی کے فروغ نے لوگوں کو غیر سیاسی بنا کر اپنے حقوق سے دستبردار کرنے کا کام کیا۔ اب مذہب کو عالمی سطح پر سوشلزم کے خلاف استعمال کیا جانے لگا۔ سعودی عرب کے شہزادہ محمد بن سلمان کے مطابق ہم نے امریکہ کے کہنے پر مسلم بنیاد پرستی کو روس کے سوشلزم کے خلاف استعمال کیا۔ داعش، القاعدہ، بوکوحرام جیسی دہشت گرد تنظیموں کو بنایا اور فنڈنگ کی۔ پاکستان میں ریاستی سطح پر بنیاد پرستی کو فروغ دیا گیا۔ نصاب تعلیم کو بنیاد پرستی کے فروغ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ کہ عمرانی علوم احساس و خیال کی ماقبل سائنسی تشکیلات و تصورات سے ابھی تک نجات حاصل نہیں کر سکے۔ جس کا فائدہ حکمران طبقات کو ہوتا رہے گا۔

یہاں پر مذہب کی سماجیات کی وضاحت ضروری ہے مذہبی سماجیات کا مطلب ہے کہ کچھ مذہبی عقائد کی سماجی افادیت کو معلوم کیا جائے۔ قصہ آدم و حوا کے ذریعے کل انسانیت کو ایک ہی ماں اور باپ کی اولاد بتانے کی سماجی افادیت یہ ہے کہ یہ عقیدہ انسانیت میں تفریق پیدا کرنے والے رنگ، نسل، قوم، اعلیٰ و ادنی یا نسلی برتری کے نظریوں کے خلاف لڑتا ہے اور انسانیت کی وحدت کو ثابت کرتا ہے یعنی انسان کو سماجی اونچ نیچ، انسان کی اپنی پیدا کی ہوئی تفریق کے خلاف مساوات چاہنے والوں کا ہتھیار ہے۔ جبکہ یہ مذہبی عقیدہ کہ ہر انسان میں خدا کی روح کا ایک جزو ہے یہ نظریہ ہر قسم کی روحانی برتری کے خلاف سب میں خدا کے ہونے کی وجہ سے ہر انسان کے دل کو خدا کا عرش بنا کر پیش کرتا ہے۔ کسی نسل کی روحانی برتری کو نہیں مانتا ہر انسان خواہ اس کا مذہب کوئی ہو۔ رنگ یا نسل کچھ بھی ہو، انسان کی روحانی برابری میں تبدیل کرتا ہے۔

تاریخی تصوریت

یہ تو ہم کتاب کے آغاز ہی میں دیکھ چکے ہیں کہ کسی بھی مادی شے میں حرکت و تبدیلی کی وجوہات کو اس کے مادی وجود سے باہر کسی خیال کو بطور عامل قیاس کرنا یا کسی خیالی عامل سے حرکت و تبدیلی کو منسوب کرنا تصوریت کہلاتا ہے۔

معاشرے میں ہونے والی تبدیلی یا ارتقا، سماج میں رونما ہونیوالے واقعات و حوادث، معاشرتی مظاہر جیسے مفلسی و خوشحالی، ربط و تنظیم اور طرز حکمرانی کو معاشرے کی طبقاتی ساخت سے باہر، انسان اور فطرت کے درمیان رشتے سے الگ کر کے خارج میں کسی خیال یا خیالی عامل سے منسوب کرنے کے زاویے سے تاریخ کا مطالعہ تاریخی تصوریت کہلاتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں قوم فلاں اخلاقی برائی کی وجہ سے تباہ ہوگئی اور کوئی دوسری قوم ایک خاص قسم کی اخلاقیات یا عقیدہ اپنانے کی وجہ سے بام عروج کو پہنچی۔ یہ تاریخی تصوریت کی ایک قسم ہے۔

پاکستان میں بے نظیر بھٹو کے دور میں یہ فتوے جاری کیے گئے کہ عورت کی حکمرانی خدا کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے اور یہ عذاب جنگوں میں شکست، معاشی بد حالی، بھوک افلاس اور بے امنی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

تاریخی تصوریت کا ایک نظریہ کہ تاریخ بادشاہوں، فاتحین اور ہیروز کی آپ بیتی کا نام ہے فاتحین اور سپہ سالاروں کے کارناموں کا مرقع ہے۔ چند شخصیتیں تاریخی ساز ہوتی ہیں۔ یہ نظریہ نجات دہندہ کا تصور پیدا کرتا ہے۔ پاکستان میں ریاستی سطح پر آئیڈیالوجی کے فروغ کے نام پر تاریخی تصوریت کی ترویج کا نتیجہ یہ ہے کہ 70 سال سے ہم نظام سے کیا مراد ہے؟ نظام کیسے بدلتا ہے؟ کو سمجھے بغیر صرف شخصیات ہی کو نجات دہندہ سمجھ کر ان کی پیروی کرتے چلے آ رہے ہیں پھر

ایک شخصیت سے مایوس ہو کر کسی دوسری شخصیت سے تبدیلی کی معصوم خواہش وابستہ کرتے رہے ہیں۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں "رموز مملکت خسرواں دانند" حکمرانی کے رازوں کو صرف بادشاہ ہی جانتے ہیں۔ یہ راز عوام کے فہم و عقل سے بالاتر ہوتے ہیں۔

تاریخ کو ان تاریخ ساز شخصیات کے ادوار، بادشاہوں کے دور اقتدار کے حساب سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ ان کے ادوار کو سنہرہ دور قرار دے کر اس دور کی خوشحالی، شان و شوکت، عدل و انصاف کا مرقع بتایا جاتا ہے اور اس دور کی فرضی اچھائیوں کو ان کی شخصیات سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ زیادہ تر تاریخ جسے ہم تاریخ کہہ کر بیان کرتے ہیں وہ حکمران طبقوں کی بڑائی، افضلیت اور مافوق البشر صلاحیتوں کے حوالے سے لکھی گئی ہوتی ہے۔ حکمران طبقہ خود ایسے خیالات کی تشہیر کی سرپرستی کرتا ہے اور یہی خیالات معاشرے کے اعلیٰ خیالات مانے جانے لگتے ہیں، کروڑوں عوام جو اپنی جسمانی اور ذہنی محنت فروخت کر کے اپنی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں اور اجتماعی نظام زندگی چلا رہے ہوتے ہیں۔ جن کی وجہ سے کاروبار مملکت، معیشت و پیداواری نظام چل رہا ہوتا ہے ان کا تاریخ میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔

صحت منداور خوشحال معاشرے کی شادمانیاں اچھے حکمران سے منسوب، پسماندہ اور تنگ دست معاشرے کی تباہ کاریاں برے حکمران سے منسوب کی جاتی ہیں اس پر مزید یہ کہ اسے "فلسفہ تاریخ" کا نام دیا جاتا ہے۔

یہ سوال کہ اچھے یا برے حکمران کہاں سے آتے ہیں انہیں کون حکمران بناتا ہے؟ اس کا آسانی سے ہر ایک کو سمجھ آجانے والا جواب تاریخ کے مذہبی نظریہ کے پاس ہے کہ خدا کائنات کا مالک ہے۔ فطرت اور معاشرہ دونوں خدا کے تخلیق کردہ ہیں۔ ان کے نظامات بھی خدا کی مرضی ومنشا کے مطابق چل رہے ہیں۔ خدا کا کائنات کو چلانے کا ایک منصوبہ ہے۔ اس کا ایک متعین مقصد ہے۔ تاریخ اس مقصد اور منصوبے کو پورا کر رہی ہے۔ جب یہ منصوبہ پورا ہو جائے گا تو تاریخ ختم ہو جائے گی۔ تاریخ ساز شخصیات جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تاریخ بناتے ہیں ان کے بارے میں ہیگل کہتا ہے کہ بظاہر یہ شخصیات اپنے ذاتی مقاصد کے حصول اور ان کی تکمیل کے لیے جدوجہد کر رہی ہوتی ہیں مگر حقیقت میں یہ خدا کے منصوبے پورے کر رہی ہوتی ہیں جس کا انہیں خود بھی علم نہیں ہوتا۔

اب جب تاریخ بنانے کا کام خدا کے سپرد ٹھہرا تو اس کے لیے اس میں کوئی خرابی ڈھونڈنا واقعات اور حالات کا تنقیدی جائزہ لینا ممکن نہیں رہتا۔ کسی بادشاہ، اولوالامر، غاصب یا فوجی آمر جس کو اس نظریہ کے تحت خدا کی طرف سے مقررہ کردہ حکمران سمجھنے کا عقیدہ راسخ کروایا جاتا ہے اس کے حق حکمرانی پر بھی سوال نہیں اٹھایا جا سکتا۔ حکمران کے حق حکمرانی اور تاریخی واقعات کو بغیر تجزیہ کے خدا کی مرضی تسلیم کروانے کے لیے حکمران طبقہ ریاست اور مذہب کو جبری ملائے رکھنے کے لیے طاقت اور پراپیگنڈا دونوں کو استعمال کرتا ہے۔

تاریخ خواہ تاریخ ساز شخصیات نے بنائی ہوتی ہے یا خدا نے ان شخصیات کے ذریعے سے بنوائی ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں عام آدمی کا تاریخ بنانے میں کوئی کردار نہیں مانا جاتا۔ تاریخی تصوریت جب تاریخ کے بارے میں یہ عقیدہ راسخ کرواتی ہے تو عام لوگوں سے یہ تسلیم کروالیتی ہے کہ تاریخ کو بدلنے میں انکا کوئی کردار نہیں اور معاشرے کے لیے ہاتھ پیر ہلانا یا کسی قسم کی جدوجہد کرنا کس قدر فضول کام ہے۔ تاریخ کے ایسے علم کے نتیجے میں مفعولیت، معاشرے سے گریز اور بے عملی پیدا کی جاتی ہے۔ ریاستی سطح پر تعلیمی نصاب، میڈیا اور مذہبی پراکسیوں کے ذریعے جبری طور پر مسلط کی گئی بنیاد پرستی کا نتیجہ یہ ہے کہ عام طور پر ووٹ کو تبدیلی کا ذریعہ نہیں سمجھا جاتا۔ عورتوں کو ووٹ کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا جو کوئی بھی جیسے بھی کسی بھی جائز یا ناجائز ذریعے سے حکمران بن جائے اکثریت اسے خدا کی مرضی سمجھ کر قبول کر لیتی ہے۔

سماجی علوم جو تاریخ سے ماخوذ ہوتے ہیں انہیں تاریخی تصوریت کے اتباع میں ترتیب دیا جاتا ہے پھر ان من گھڑت تصورات سے تاریخی تصوریت کے نظریئے کو سچ ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے یہ تصور کہ انسانی فطرت ناقابل تغیر ہے۔ انسانی رویے چونکہ انسانی فطرت نے تشکیل دیئے ہوتے ہیں اس لیے یہ رویے بھی ناقابل تغیر ہیں لہٰذا انسانی معاشرہ بھی ایک جامد شے ہے۔ انسانی تاریخ بھی جامد شے ہے یہ محض سبق آموز کہانیوں کا ریکارڈ ہے۔ فطرت کبھی تبدیل نہیں ہوئی، انسان جب خود کو ہی تبدیل نہیں کر سکتا تو معاشرے کو کیسے تبدیل کرے گا۔ سماجی علوم کے ایسے نظریات کو مسلمات بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ایسے سماجی علوم آنے والے وقتوں میں سماجی تبدیلی کے عمل میں رکاوٹیں ڈالنے کے لیے استعمال ہونے لگتے ہیں۔

اس صورت میں ان کے سحر کو توڑنا ضروری ہو جاتا ہے۔ خدا کے نام پر اقتدار یا مقدس

کتابوں اور صحیفوں کی حکمرانی کے نام پر بھی ہمیشہ ایک چھوٹی سی مذہبی اقلیت ہی حکمرانی کرتی ہے وہ تمام نام نہاد ابدی قدریں جنہیں نیکی، سچائی اور حسن کہا جاتا ہے جن کے گرد افلاطون نے تقدس کا ہالہ بنا دیا تھا، سب کی سب سماجی تغیرات ہیں، معاشرے سے الگ ان کا کوئی وجود نہیں بلکہ یہ اقدار معاشرے کے ساتھ ساتھ نمو بھی پائی ہیں اور تبدیل بھی ہوتی رہتی ہیں۔

جب تاریخ کو ایسی شخصیات کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے جن کو تاریخ ساز شخصیات کہا جاتا ہے تو عام آدمی کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ تاریخ کو بنانے میں اس کا اپنا کوئی کردار نہیں کیونکہ ان ہستیوں کو غلطیوں سے پاک اور خطا سے مبرا بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ عام آدمی سمجھتا ہے کہ انسان تو خطا کا پتلا ہے اور یہ ہستیاں کوئی مافوق الفطرت ہستیاں ہیں جن سے کوئی خطا سرزد نہیں ہوتی۔ اگر یہ ہستیاں مذہبی ہوں تو ان کی بڑائی اور عام انسانوں سے بلند ترین ظاہر کرنے کے لیے معجزے بھی تخلیق کیے جاتے ہیں جو ان ہستیوں سے سرزد ہوئے بتائے جاتے ہیں۔ عام لوگوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ کیوں کہ ہم پانی پر نہیں چل سکتے تو معاشرے میں کوئی تبدیلی کیسے لا سکتے ہیں۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ ہم ان تک نہیں پہنچ سکتے تصوریت کے زاویے سے لکھی گئی تاریخ میں فاتحین اور بیرونی حملہ آوروں کو نجات دہندے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے حملوں کو مذہبی فریضہ کا پورا کرنا بیان کیا جاتا ہے۔ مذہبی فریضے کے طور پر کسی علاقے پر قبضہ کرنے والے کا دور حکومت ہمیشہ شاندار اور دلکش بتایا جاتا ہے ایسے ادوار کو مذہبی اور مذہب کی وجہ سے خوشحال دور کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ایسی تاریخ بیان کرنے سے لوگوں میں مذہب کے احیاء کی تحریکیں ابھارنا مقصد ہوتا ہے مذہب کے احیاء کی تحریک کے پیچھے جس طبقے کے مفادات پوشیدہ ہوتے ہیں وہ ان تحریکوں کی حمایت کے لیے ایسی تواریخ کی تشہیر کرتا ہے یا لکھواتا ہے۔ نسیم حجازی اور طارق اسمٰعیل ساگر کی تاریخ کی کتابیں علامہ اقبال کی شاعری کو اگر ایک فقرے میں بیان کیا جائے تو ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو'' ماضی پرستی ابھارنے کا ذریعہ رہے ہیں۔

تاریخی تصوریت کے نظریات کو معاشرے میں قدامت پرستی پر فخر کرنے اور جدیدیت کے تصورات میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ عام لوگوں کے ذہن میں ماضی کی اتنی شاندار اور دلکش تصویر پیش کی جاتی ہے اور مستقبل کا ہمیشہ مسائل، بے انصافیوں اور بدامنی سے بھرپور نقشہ کھینچا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں عام آدمی کی جو ذہن سازی ہوتی ہے کہ لوگ تاریخ کے

پہیہ کو پیچھے کی طرف گھمانا چاہتے ہیں نہ صرف مقامی حکمران بلکہ عالمی سرمایہ داری بھی اس صورتحال کا معاشی فائدہ اٹھاتے ہیں۔

پاکستان کی 70 سال کی تاریخ دو طرح کی تاریخ ہے۔ ایک عوام کی تاریخ۔ دوسری حکمران طبقے کی تاریخ، پاکستان کے عوام کی تاریخ اپنے حقوق کے لیے مسلسل اور انتھک جدوجہد کی تاریخ ہے۔ تقسیم کے وقت عام لوگ خون کا دریا اور لاشوں کے پہاڑ عبور کرنے کے بعد سے اب تک اپنے حقوق سے دستبردار نہیں ہوئے۔ کہیں نہ کہیں دبی ہوئی چنگاری کی طرح ابھرتی ہوئی تحریکیں لاٹھی اور گولی سے دبائی جاتی رہی ہیں۔

دوسری طرف حکمران طبقات کی 70 سالہ تاریخ عوام کو ان کی بنیادی معاشی ضرورتوں سے محروم رکھنے اور سیاسی حقوق غصب کر کے بزور طاقت انہیں اپنے حقوق سے دستبردار ہونے پر مجبور کرنے کی تاریخ ہے۔ جس کے لیے حکمران طبقات نے دو طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ معاشی حقوق کے سیاسی حصول کیلئے عام آدمی کی آواز دبانے کا پہلا ہتھکنڈہ یہ کہ حکمران طبقات نے طویل مدت تک کے لیے فوجی ڈکٹیٹروں کو استعمال کیا۔ دوسرا ہتھکنڈہ کہ لوگ اپنی آزاد مرضی سے اپنے حقوق سے دستبردار ہو جائیں اس کے لیے ریاستی سطح پر مذہب کو مسلط رکھنا بنیاد پرستی اور تاریخی تصوریت جیسے نظریوں کو نصاب کا حصہ بنانا شامل ہے۔ ایسی دونوں کوششوں میں حکمرانوں کو نہ صرف مقامی حکمران طبقات بلکہ عالمی سرمایہ داری کی سرپرستی بھی حاصل رہی ہے۔

عام آدمی کا فلسفہ

تاریخی مادیت دراصل سماج کی سائنس ہے۔ سماج کی سائنس کی اہم ترین دریافت یہ ہے کہ جو لوگ انسانی زندگی کی بقا کے لیے روزی پیدا کرتے ہیں وہی لوگ تاریخ بناتے ہیں، غاروں میں زندگی گزارنے والے انسان کی تہذیب سے لے کر انسان کو خلائی سفر پر روانہ کرنے والی تہذیب تک کی ترقی کی عمارت خواہ آسمان کو چھونے لگ جائے اس کی ہر منزل کو استوار کرنے اور آگے بڑھانے میں عام آدمی کی محنت شامل ہے۔

مادیت ہی وہ فلسفہ ہے جس نے انسان کے لیے کائنات کے راز کھولے، اسے خوف، توہمات اور فکری دلدل میں پھنسانے والی من گھڑت کہانیوں پر مبنی عقیدوں اور منزل کی طرف جانے والے راستوں سے گمراہ کرنے والے قیاسی علوم سے نجات دلائی۔ دنیا کی ساری تاریخیں، ومسالک وفرقے، اخباریں، ناول، معاشرتی علوم اور مابعد الطبیعات اس بات پر مامور ہیں کہ عام آدمی کو اپنی طاقت کا پتہ نہ چلنے پائے ان کا مقصد ہے کہ عام آدمی کو یقین دلا دو کہ تاریخ میں اس کا کوئی کردار نہیں بس وہ کچھ دن گذارنے کے لیے آتا ہے اور اچھے یا برے دن گزار کر واپس چلا جاتا ہے آخر تو اسے جانا ہے تو یہاں گزارے گئے اچھے یا برے دنوں کا تجزیہ کرنے یا انہیں بدلنے کی کیا ضرورت؟ دوسری کوشش عام آدمی کے اکٹھ کے خلاف کی جاتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تقسیم رہے۔ ذات پات میں، مسلکوں و مذاہب میں، قوموں اور نسلوں میں، دنیا میں آج تک جتنی سائنسی دریافتیں ہوئی ہیں وہ ان لوگوں نے کی ہیں جن کا تعلق نچلے اور متوسط طبقے کے عام آدمی سے ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی دریافتوں او ایجادات کو سرمایہ داروں نے منافع کمانے کی غرض سے تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ سائنس نے مادی دنیا کے قوانین دریافت کیے،

ایجادات کیں اور ان ایجادات سے انسانیت کو فائدہ پہنچایا۔ اندھیروں کو روشنیوں میں بدلا، ٹرانسپورٹ کی ایجادوں سے فاصلوں کو سکیڑا، پیداوار کو کئی گنا بڑھایا، جسمانی بیماریوں پر قابو پایا، انسان کو فطرت کی غلامی سے نکال کر فطرت کی لگام انسان کے ہاتھ پکڑائی۔ جس طرح فطرت انسان کے تابع تسخیر ہے اس طرح انسانی سماج بھی اس کے تابع تسخیر ہے۔ کیونکہ انسانی سماج کو فطرت سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ تسخیر مادہ کی طرح تسخیر معاشرہ نے انسان کو یہ طاقت بخشی کہ معاشرتی اونچ نیچ، سماجی و معاشی نابرابری اور سماجی بیماریوں کا علاج کرنے کے قابل ہو تسخیر معاشرہ کی حاصلات کو تاریخی مادیت کہتے ہیں۔

تاریخی مادیت ہی عام آدمی کا فلسفہ ہے۔ یہ نہ صرف معاشرے میں عام آدمی کو، جسمانی اور ذہنی محنت فروخت کر کے اپنا پیٹ پالنے والے کو، فطرت کے بطن سے عالم انسانیت کے لیے روزی پیدا کرنے والے کو اس کے مقام سے واقفیت دلاتا ہے بلکہ تبدیلی کے عمل میں عام آدمی کے کردار کو متعین کرتا ہے۔ عام آدمی پر اپنے طبقے کے معاشی و سیاسی حالات بدلنے کی ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ عام آدمی کا حق حکمرانی تسلیم کرتا ہے یہی انقلاب کا فلسفہ ہے جو عام آدمی کا فلسفہ ہے۔

تاریخی مادیت

انسان انفرادی طور پر فانی ہے مگر مجموعی طور پر لافانی۔ انسانی سماج نے خانہ بدوش شکاری گروہوں سے ترقی کرتے کرتے، قبائلی دور میں ہزاروں سال گزار کر، زرعی پیداوار کی معیشت کے دور میں قدم رکھا اور جمہوری سیاسی نظام اپنایا۔ پیداوار کے ان بدلے ہوئے طریقوں نے جن نئے طبقات کو جنم دیا ان کے درمیان کشمکش کے نتیجے میں انسانی معاشرے نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور سوشلسٹ معیشت کے عوامی راج کے سیاسی نظام میں داخل ہو گئے۔ انسانی سماج کے ارتقا کی ہر منزل عام آدمی کی اپنی تعمیر کی ہوئی ہے اسے خود کو وقتی طور پر بدلتے ہوئے نظاموں کا فائدہ نہ بھی ہوا ہو لیکن انسانی سماجی کی اجتماعی ترقی میں اس کا سب سے اہم کردار رہا ہے۔ ان افراد کی کاوشیں کبھی زائل نہیں ہوتیں بلکہ ایک مشترکہ انسانی روایت میں ضم ہو کر اس کا انمٹ جزو بن جاتی ہیں۔

انسانی معاشرہ بھی فطرت یا مادی کائنات کے اہم جزو کی حیثیت سے مادی وجود رکھتا ہے اور مادی کائنات کی طرح ارتقا پذیر بھی ہے۔ معاشرے کے ارتقا پذیر مادی وجود ہونے کی دریافت نے یہ ممکن بنایا کہ معاشرے کے ارتقا کے قوانین دریافت کیے جائیں۔ فطرت اور معاشرے کے ارتقا میں کچھ یکسانیت بھی پائی جاتی ہے اور کچھ اختلاف بھی، اینگلز نے فطرت اور سماج کے ارتقا کے قوانین میں اختلاف کو اس طرح واضح کیا ہے "سماج کے ارتقا کی تاریخ ایک لحاظ سے فطرت کے ارتقا کی تاریخ سے مختلف ہے۔ فطرت میں اندھی اور بے شعور قوتیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ جن کے باہمی ردعمل سے عام قوانین وجود میں آتے رہتے ہیں۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ کسی ایسے مقصد کے مطابق نہیں ہوتا جس کی خواہش شعوری طور پر کی جائی ہو۔ جس کے برعکس سماج کی تاریخ میں سارے اداکار با شعور ہوتے ہیں جو سوچ سمجھ کر یا جوش کے تحت معین مقاصد کے لیے عمل کرتے ہیں۔ کسی باشعور تہیہ کے بغیر، کسی باارادہ مقصد کے بغیر کچھ نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود اس حقیقت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا

کہ تاریخ کے دھارے پر بھی اندرونی قوانین کا راج ہے۔"

یہ بات تو تاریخی تصوریت میں بھی تسلیم شدہ ہے اور خاص طور پر ہیگل کے بیان کے مطابق کہ تاریخ ساز ہستیوں کو ظاہری اور واقعی اعمال کے محرکات کے پیچھے ماورائی قوتیں ہیں، تاریخی تصوریت ان قوتوں کو اپنی طرف سے باہر سے تاریخ میں داخل کرتی ہے۔ اس کے برعکس تاریخی مادیت معاشرے میں تبدیل و ارتقا کی وجوہات کو انسانی معاشرے کی طبقاتی ساخت، بقائے زندگی کی جدوجہد کے دوران پیداواری عمل اور انسانوں کے درمیان آپسی تعلقات میں تلاش کرتی ہے۔ یہ تسخیر معاشرہ کا عمل ہے جس سے سماج کی سائنس نے جنم لیا، سماجی سائنس کی یہ دریافت کہ معاشرے میں حرکت و تبدیلی کا منبع بھی داخلی تضادات ہی میں مضمر ہے اس کو جدلی مادیت کے ہم پلہ بنا دیتی ہے، پھر داخلی تضادات کی وجہ سے انسانی معاشرے کے ارتقا پذیر ہونے کے نظریے سے تاریخ کا مطالعہ تاریخی مادیت کا موضوع ہے۔

انسانی معاشرے میں ہونے والی حرکت و تبدیلی کو فطرت کے مادی تصور سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ مادی علم کی طرح معاشرتی علم بھی اپنے نظریات کی صحت و صداقت جانچنے کے لیے عمل کا تقاضا کرتے ہیں اور تاریخ اس تصدیق اور تجزیے کے لیے معاشرتی تحریکوں میں موجود حرکی عمل کا مواد مہیا کرتی ہے۔

ابتداء میں تاریخ کو لکھنے والے اسے بڑے لوگوں کی دلچسپ کہانیاں بیان کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے یا ان واقعات کی حیثیت سبق آموز کہانیوں سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی تھی پھر سماج نے ایک قدم آگے بڑھایا، بادشاہت کے زمانے میں ایک عرصہ تک تاریخ میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو سیاسی تبدیلیوں کے پس منظر میں بیان کیا جانے لگا۔ یہ ابن خلدون تھا جس نے اپنی کتاب مقدمہ تاریخ میں یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ سماج کا ارتقا معاشی عوامل سے متعین ہوتا ہے۔

یورپ میں جب فلسفیانہ لبرلزم کی تحریک چلی اور انسانی برابری کے خیالات ترویج پانے لگے۔ جیسا کہ "تمام انسان پیدائش کے وقت مساوی ہوتے ہیں۔ بعد ازاں ان کی عدم مساوات یا سماجی اور معاشی اونچ نیچ اس وقت کے مروج نظام و حالات کا نتیجہ ہوتی ہے"۔ بیالوجیکل سائنسوں کی ترقی نے بھی انسان کی بائیلوجیکل برابری کی حقیقت کا انکشاف کر دیا تو انسانوں کے بارے میں برتری کے مصنوعی اور گمراہ کن نظریوں اور عقیدوں نے دم توڑنا شروع کر دیا۔ پھر مذہب کو ریاست سے الگ کرنے کی تحریکیں زور پکڑنے لگی اور عقائد کو ہر انسان کا ذاتی مسئلہ سمجھا جانے لگا کسی کے

عقیدے میں ریاست کی طرف سے مداخلت نہ کرنے کی سوچ غالب آنے لگی۔ موروثی خصوصیات کا عقیدہ بھی دم توڑنے لگا۔ عقیدہ، مسلک، رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر ہر انسان کے لیے تعلیم کو اس کا بنیادی حق تسلیم کرنا پڑا۔ ان حالات میں لوگوں نے بادشاہ کے خداداد حق فرمانروائی کو مسترد کر دیا۔ چونکہ تمام انسان صلاحیتوں کے مالک ہیں عقل و شعور رکھتے ہیں اس لیے لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لیے اپنی مرضی کی حکومت منتخب کریں اس نظریہ کی مقبولیت عام ہونے لگی۔

سائنسی اور سماجی علوم مختلف اصناف میں تقسیم ہو کر الگ الگ مطالعہ بھی کر رہے تھے اور ایک واحد اور نمو پذیر معاشرے کا ایک کلی مطالعہ بھی جاری تھا۔ نیپلز سے تعلق رکھنے والے قانون دان ویکو نے تاریخ کے مطالعہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اسے صَرف سیاسی تبدیلیوں میں سمجھے جانے کی قید سے نکالا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ ”معاشرہ اپنے تمام تر مظاہر......شاعری، قانون اور مذہب کے ساتھ ایک وحدت میں ہوتا ہے۔ یہ وحدت کوئی جامد حقیقت نہیں ہوتی بلکہ مسلسل تغیر و تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہوتی ہے۔“ وہ کہتا ہے کہ انسانی تاریخ میں جو تحریکات جنم لیتی ہیں ان ہی سے اداروں کا تعین ہوتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ گزرے ہوئے ادوار کا ادب اور قوانین اپنے عہد کے معاشرتی ارتقا کی خصوصیت کو منعکس کرتے ہیں۔

سرمایہ داری دور میں سماجی بیماریوں، غربت و افلاس، غلامی، جبر و استحصال، جہالت اور جنگوں کے اسباب کو بھی معاشرے کے اندرون تلاش کرنا شروع کر دیا گیا تھا تسخیر معاشرہ کا یہ عمل بہت دیر سے شروع ہوا جبکہ تسخیر مادہ کا عمل ہزاروں سال پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ پیداواری نظام، تقسیم دولت، معاشی طبقے، ان طبقوں کے مفادات کے درمیان ٹکراؤ، معاشرتی انصاف کی پر جوش خواہش، اس خواہش کے بل پر تبدیلی کی تحریکیں اور ان تحریکوں کی حکمت عملی اور ان کے حرکی عمل کے مطالعہ میں وسعت آ رہی تھی۔ سائنسی علوم کی ترقی صرف اور صرف اس وقت ممکن ہو سکی جب ان کے انکشافات کو فطرت کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جانا ممکن ہوا۔ ٹیکنالوجی نے یہ میدان فتح کیے لیکن اب ضرورت ایک ایسے علم کی تھی جو مادے کی تسخیر کی طرح معاشرے کی تسخیر کے لیے موثر ثابت ہو اور یہ تسخیر ان لوگوں کے ذریعے ہی ممکن تھی جو خود تبدیلی کے عمل کا سرگرم حصہ ہوں۔

مارکس معاشی انصاف کا پر جوش حامی اور اس کے لیے عملی جدوجہد میں شریک ایسی شخصیت تھی جو معاشرے کے بارے میں ایک مربوط اور ایک نئے نظریے کی تشکیل کرنے کے قابل ہوا۔ ہیگل کی منطق میں داخلی تضاد سے پیدا ہونے والے تغیر کا تصور موجود تھا جس نے مارکس کو اس

قابل بنایا کہ وہ تمام معاشرتی تحریکات میں موجود حرکی عمل کو بیان کر سکے۔ مارکس نے اس حرکی عمل کی قوت محرکہ کو اس جدوجہد میں دریافت کیا جس میں ستم رسیدہ لیکن بغاوت پر آمادہ طبقات ایک قابل برداشت اور بھرپور زندگی حاصل کرنے کے لیے شامل ہوتے ہیں۔

اس نے مزید ثابت کیا کہ پیداوار کے طریقوں میں تکنیکی اور معاشی تبدیلیوں کے باعث نیز لوگوں کے درمیان قانونی، معاشرتی اور معاشی رشتوں کی تبدیلیوں کی بنا پر، یکے بعد دیگرے نئے نئے طبقات پیدا ہوتے چلے گئے۔ پرانے نظام سے برہمی اور نیک مقصد کا ہونا کسی طبقاتی جدوجہد میں کامیابی کی ضمانت نہیں ہو سکتی اس کے لیے ایک اور معاون قوت کی ضرورت ہے اس قوت کا نام ہے طبقاتی شعور۔ اس ضمن میں وہ یہ کہتا ہے کہ پہلے سے گھڑا گھڑایا نظریہ اس جدوجہد میں کام نہیں آ سکتا۔ معاشرتی تاریخ کے حقائق ہی اس نظریے کی صحیح معنوں میں تشکیل و تعمیر کر سکتے ہیں۔ عام آدمی کا فلسفہ یا تاریخی مادیت کے آپ کی سمجھ میں آ جانے کی نشانی یہ ہے کہ وہ معاشرتی تبدیلی کے لیے سیاسی عمل میں منعکس ہو۔

مارکس سے پہلے فلسفے کو محض ایک تجرید سمجھا جاتا تھا یعنی تصورات کا ایک فاضلانہ مطالعہ جس کا روزمرہ زندگی کے عملی مسائل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ روایتی طور پر فلسفی ایسے شخص کو سمجھا جاتا تھا جس کی خاص دلچسپی حقیقت کے عمیق ترین ماہیت کو معلوم کرنے کی کوشش میں مضمر ہو۔ مارکس نے فلسفے کو عام آدمی کا فلسفہ بنا کر اس کو کارآمد اہمیت سے روشناس کروایا۔

مارکس کی حیثیت ایک نیا نظام افکار وضع کرنے والے ایک فرد ہی کی نہ تھی۔ وہ محض سائنسی صداقتوں پر غور و فکر کرنے تک خود کو محدود نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ وہ ان صداقتوں کو معاشرے کی تبدیلی کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس نے محسوس کیا۔ اس کے دریافت شدہ معاشرتی ترقی کے قوانین نے پہلی بار موثر، باشعور اور بالارادہ سماجی عمل کے لیے موقع فراہم کیا ہے۔

مادی علوم سے متعلق سائنسدان قانون فطرت کا علم حاصل کرتے اور مادی قوتوں کے استعمال سے جس طرح فطرت کی تبدیلی روبہ عمل لے آتے تھے یہی طریقہ مارکس کے نزدیک اتنی ہی کامیابی سے اب سماجی دائرے میں بھی برتا جا سکتا ہے۔

مارکس نے تاریخ کی تشریح و تعبیر معاشی مفہوم میں کی ہے۔ اس نے اپنی کلاسیکی تصنیف ”سرمایہ“ میں ثابت کیا ہے کہ کس طرح انسانی تاریخ میں رونما ہونے والی اہم تبدیلیاں یعنی نظام غلامی

کی حامل کلاسیکی ریاستوں کا جاگیردارانہ نظام کی حامل ریاستوں میں تبدیل ہو جانا اور بعدازاں ان ریاستوں کا سرمایہ دارانہ نظام میں ڈھل جانا اساسی طور پر معاشی محرکات ہی کا نتیجہ رہی ہیں اور ان تبدیلیوں کا انحصار طریق پیداوار کی تبدیلیوں پر رہا ہے۔ مارکس معاشی تنظیم کے ہر مرحلے کو بشمول نظام سرمایہ داری ایک تاریخی مرحلے کے طور پر دیکھتا ہے۔ معاشی نظام کے سلسلے وار مرحلوں میں انسان اپنی مادی ضروریات پوری کرنے کے لیے مختلف انداز میں فطرت کے مادی وسائل کام میں لاتا ہے۔ ہر مرحلے میں معاشرے کا ڈھانچہ بنیادی طور پر پیداوار کے تکنیکی معیار سے متعین ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ایسے معاشرے میں جس میں فیکٹریوں کو اندر بڑے پیمانے پر پیداوار عمل میں آتی ہے کنگاروں کا شکار کرنے والے معاشرے کی بہ نسبت زیادہ بہتر اور اعلیٰ تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ معاشرے کی مرکبات کو سمجھنے کے لیے اسے ہم دو حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں۔

(۱) سماجی ساخت (سماجی وجود) جسم

(۲) بالائی ڈھانچہ (سماجی شعور) دماغ

ہماری سماجی ساخت طرز پیداوار کی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے اور بالائی ڈھانچہ جس میں سماجیات اخلاقیات، قانون، سیاست و مذہب اور ان سے منسلک تصورات۔ ایک طرف تو ہمارے سماجی وجود کا عکس ہوتے ہیں مگر دوسری جانب یہ سماجی وجود پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ ہمارے سماجی شعور اور سماجی وجود کے درمیان ایک جدلیاتی رشتہ ہے۔ دوطرفہ اثر انداز ہونے والا عمل۔

مارکس کے نزدیک پیداواری قوتیں اور پیداواری رشتے ہی معاشرتی حقیقت پر کلی طور پر یہ حاوی نہیں ہوتے۔ ہر نیا طبقہ خود کو مستحکم کرنے کی جدوجہد میں پرانے حکمران طبقے کے قوانین رسوم ورواج، انداز واطوار اور خیالات سے متصادم ہونے کی راہ اختیار کرتا ہے۔ وہ ایسا اس لیے کرتا ہے کہ یہ تمام مظاہر قدیم حکمران طبقے کے نظریاتی بالائی ڈھانچے کا حصہ ہوتے ہیں اور ان ہی کے ذریعے یہ طبقہ اپنا غلبہ اور اقتدار قائم رکھتا ہے۔ اس نئے طبقے کو فتح حاصل کرنے کے لیے ایک نئی اور مختلف قسم آئیڈیالوجی اپنانا پڑتی ہے یہ آئیڈیالوجی عام آدمی کا فلسفہ ہے جو اسے حصول قوت میں علم، جوش اور جذبہ عطا کرتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سماج بھی ارتقائی مراحل سے گزرتا رہتا ہے اور سماج کو تبدیل کرنے کے طریقے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ ان طریقوں کا انحصار مستقبل کے انقلابات کی حکمت عملی کو سمجھنے اور عام آدمی کے فلسفے کی درست تفہیم پر ہے۔

نظام سے کیا مراد ہے؟ ایک نظام کے قابلِ عمل ہونے کی کیا شرائط ہیں؟ ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام کس طرح لیتا ہے؟ تبدیلی کسے کہتے ہیں؟؟

یہ ہے وہ بنیادی نقطہ جس سے واقف نہ ہونے کے باعث ہمارا 70 سالہ سفر بے سمتی کا شکار رہا۔ ہندوستان کی تقسیم کو جن طبقوں نے اپنی پسماندگی کا حل سمجھا تھا اس کے لیے جو حکمت عملی اور نظریہ اپنایا تھا اس کے مضمرات کے نتیجے میں برطانوی غلامی سے نکل کر بڑی آسانی سے عالمی سرمایہ داری کی معاشی غلامی اور عالمی سرمایہ داری کے سرغنہ امریکہ کی سیاسی غلامی میں آ گئے۔ کبھی اسلامی فلاحی مملکت کے نعرے کو، کبھی سوشلزم کے روٹی کپڑا اور مکان کے نعرے میں، کبھی اسلامی مملکت کے خواب کو، کبھی آئین و جمہوریت کی بحالی کے آدرش کو مسائل سے نجات کے لیے تبدیلی کی خواہش کے پورا ہو جانے کا وسیلہ سمجھا، کبھی جاگیرداروں، کبھی فوجی جرنیلوں، کبھی تجارتی سرمایہ داروں کو نجات دہندہ سمجھ کر اپنا مستقبل ان کے حوالے کیا۔ لیکن ہر نعرے اور ہر نام نہاد نجات دہندہ کے چہرے سے وقت نے نقاب اتارا تو وہ جدید نوآبادیاتی نظام ہی کا ایک پہرہ نکلا۔ تبدیلی کی سائنس سیریز کا مقصد تبدیلی کی وقتی معصوم پرجوش خواہش کو ایک ٹھوس قابل عمل حکمت عملی کے ساتھ جوڑا ہے تاکہ آنے والی نسلیں اپنے مستقبل کو اپنے ہاتھ میں لے سکیں۔ سیریز پانچ کتابوں پر مشتمل ہے۔

- عام آدمی کا فلسفہ
- عام آدمی کے فلسفے کی عملی تعبیر
- عام آدمی کے حقوق کا محافظ نظام
- عام آدمی کے محافظ نظام کی حکمت عملی
- پارٹی

2019

978-969-593-301-5



سانجھ
SANJH PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com